وہی ایک زخم گلاب سا
اعتبار ساجد

وہی ایک زخم گلاب سا
اِعتبار ساجد

فہرست

کچھ اعتبار ساجد کے بارے میں

پروفیسر نظیر صدیقی

اعتبار ساجد دورِ حاضر کے اہلِ قلم میں بہت معروف و ممتاز ہوں یا نہ ہوں وہ گمناموں اور بے نشانوں میں سے ہرگز نہیں ہیں۔ وہ پاکستان کے ادبی افق پر کوئی بیس پچیس سال پہلے ایک شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے۔ اگرچہ اس دوران میں وہ صرف شاعر نہیں رہے مضمون نگار، افسانہ نگار، کالم نگار اور سفرنامے کے مصنف کی حیثیت سے بھی سامنے آ چکے ہیں۔ ان تمام اصناف ادب میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی شناخت زیادہ تر شاعر ہی کی حیثیت سے ہے۔ اور وہ بھی غزل کے شاعر کی حیثیت سے۔ گو انہوں نے آزاد نظم کی صنف میں نظمیں خاصی تعداد میں لکھی ہیں۔

اس وقت تک اعتبار ساجد کی غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''وہی ایک زخم گلاب سا'' بھی شامل ہے۔

اچھی کتابیں وہ ہیں جو اہلِ نظر کی نظر سے گزریں اور وہ پوری غیر جانبداری کے ساتھ ان کے بارے میں موافقانہ رائے قائم کر سکیں یعنی بقول غالب اچھی کتابیں وہ ہیں جن پر قلم اٹھانے والے مصنف کے طرف دار نہ ہوں بلکہ سخن شناس اور سخن فہم ہوں۔ افسوس کی بات یہ ہے

کہ آج کتابوں کے اچھے یا برے ہونے کے معاملے میں غالب کے اس معیار یا اس کسوٹی کو نظرانداز کردیا گیا ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کا ہر ادیب اور شاعر باون گز کا نظر آتا ہے حالانکہ شعروادب میں باون گز سے کم کا نظر آنا بھی کچھ کم فخر کی بات نہ تھی۔لیکن چونکہ یہ دور پبلسٹی اور پروپیگنڈے کا دور ہے جس کے ذریعے معمولی سے معمولی لکھنے والے کو ایک عظیم ادیب یا شاعر بنا دیا جاتا ہے۔اس لئے کوئی بھی ادیب یا شاعر عظیم کہلانے سے کم پر راضی نظر نہیں آتا۔

یہ بات بہت کم لکھنے والوں کی سمجھ میں آتی ہے کہ شعروادب میں صرف اچھے ہونے کے معیار تک پہنچنا بھی آسان نہیں ہوتا۔جبکہ کسی ادیب یا شاعر کا صرف اچھا ہونا کافی نہیں۔اس کے لئے غیر معمولی اور غیر فانی ہونے کے معیار تک پہنچنا بھی ضروری ہے۔یعنی اسے چاہئے کہ وہ غیر معمولی اور غیر فانی ہونے کی سطح کو بھی چھو سکے۔

اعتبار ساجد یقیناً ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔ان کے ایک ہونہار یعنی ایک Promising Poet ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔لیکن ایک اچھے شاعر اور ایک غیر معمولی شاعر کے درمیان جو فاصلہ ہے اسے وہ ابھی تک طے نہیں کر سکے ہیں۔ممکن ہے ان کی شاعرانہ جدوجہد انہیں کسی وقت اس منزل تک پہنچا دے۔اگر وہ زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے تو ممکن ہے دس پانچ شعر ایسے بھی کہہ جائیں یا دو چار نظمیں ایسی بھی لکھ جائیں جنہیں غیر فانی کہا جا سکے۔ان باتوں کا تعلق ان کے مستقبل سے ہے اور مستقبل کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ادب یا شاعری صرف زور بازو کا کام نہیں اس امتیاز یا اعزاز کے حاصل کرنے میں تقدیر کو بھی دخل ہوتا ہے۔

سرِ دست ان کی شاعری کے معاملے میں صرف یہ دیکھنا کافی ہوگا کہ وہ کس قسم کی شاعری کر رہے ہیں۔ایک شاعر کی حیثیت سے ان کے مسائل کیا ہیں۔ان کی شاعری زندگی کے کس علاقے سے رکھتی ہے۔اس علاقے کی عکاسی اور ترجمانی میں وہ کہاں تک کامیاب ہیں' ان کی شاعرانہ حساسیت انہیں حیات وکائنات کے سمجھنے میں کہاں تک مدد دے رہی ہے۔وہ صرف سامنے کی باتیں کہہ رہے ہیں یا فکرووجدان کی گہرائیوں سے بھی کچھ تعلق رکھتے ہیں؟

اعتبار ساجد نے اپنی کتاب میں ''تیرا میر اکیلا روتا ہے'' کے عنوان سے ایک خیال انگیز اور تفکر طلب ابتدائیہ لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت عام شاعروں سے زیادہ ہے۔زندگی اور زمانے کے تغیرات پر ان کی نظر گہری ہے۔وہ تغیرات کو صرف محسوس ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان تغیرات کے پیدا کردہ تلاطم سے دست و گریبان بھی ہیں۔ان کا یہ ابتدائیہ غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔اس ابتدائیے کی روشنی میں ان کی مجموعی شاعری جو انہوں نے اب تک کی ہے نہ صرف اس شاعری کا جواز سمجھ میں آسکے گا بلکہ اس کی معنویت پورے طور پر واضح ہوسکے گی۔

اس میں شک نہیں کہ اعتبار ساجد کی شاعری بے ناسازگار حالات کی شاعری ہے۔اس بات پر انہیں خود بھی حیرت ہے کہ

میں کسے سنا رہا ہوں یہ غزل محبتوں کی
کہیں آگ سازشوں کی' کہیں آنچ نفرتوں کی

○

مرا کون سا ہے موسم مرے موسموں کے والی!
یہ بہار بے دلی کی' یہ خزاں مروتوں کی

○

میں قدیم بام و در میں انہیں جا کے ڈھونڈتا ہوں
وہ دیار نکہتوں کے' وہ فضائیں چاہتوں کی

شاعر کو نکہتوں کے دیار اور چاہتوں کی فضا ڈھونڈنے کے لئے قدیم بام و در یعنی ماضی کی طرف کیوں سفر کرنا پڑتا ہے۔اس کا ایک اہم سبب اعتبار ساجد یہ بتاتے ہیں کہ

کوئی پاس عزیز از جان کہاں
ہمسائے کا نام و نشان کہاں
اب میر اکیلا روتا ہے!

اعتبار ساجد کی جنگ اپنی ذات سے نہیں، اپنے زمانے سے ہے جو طرح طرح کی نفسا نفسی کا شکار ہے۔ ممکن ہے ان کی شاعری کا یہ مجموعہ غزلوں اور نظموں کا نہیں نوحوں اور مرثیوں کا مجموعہ معلوم ہو اور یہ نوحے اور یہ مرثیے دونوں مل کر دورِ حاضر کی ایک ایسی تاریخ مرتب کر رہے ہیں جسے پڑھتے وقت آپ بھول جائیں کہ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز نے کون سے ادبی انعامات جاری کئے، وہ انعامات کس طرح کے شاعروں کو ملے، ان انعامات کے دینے والوں کے پاس شاعری کی سچی پہچان تھی بھی یا نہیں۔ اب یقیناً ہم ایک ایسے دور میں آ گئے ہیں جس میں شعر کہنے والے اور لوگ ہیں، مشہور ہونے والے اور لوگ اور انعام پانے والے اور لوگ۔ یہ تینوں خوبیاں ایک شخص میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ اس المناک صورت حال پر تھوڑا سا رو لینا بھی بے جا نہ ہوگا!

الحمدللہ

شکر ہے خداوندا، انکسار قائم ہے
ہم نیاز مندوں کا، اعتبار قائم ہے

ایسے خشک موسم میں، تیری ہی عنایت سے
گلشن تمنا کا کاروبار قائم ہے

شکر ہے مرے مالک، بھیڑ میں کتابوں کی
اپنے چند لفظوں کا اعتبار قائم ہے

آج بھی مہکتی ہیں اپنے حرف کی کلیاں
آتے جاتے موسم میں یہ بہار قائم ہے

اہلِ دل کی محفل میں، اہل فن کی مجلس میں
اعتبار ساجد کا اعتبار قائم ہے

O

میں کسے سنا رہا ہوں یہ غزل محبتوں کی
کہیں آگ سازشوں کی، کہیں آنچ نفرتوں کی

کوئی باغ جل رہا ہے، یہ مگر مری دعا ہے
مرے پھول تک نہ پہنچے یہ ہوا تمازتوں کی

مرا کون سا ہے موسم مرے موسموں کے والی!
یہ بہار بے دلی کی، یہ خزاں مروتوں کی

میں قدیم بام و در میں انہیں جا کے ڈھونڈتا ہوں
وہ دیار نکہتوں کے، وہ فضائیں چاہتوں کی

کہیں چاند یا ستارے ہوئے ہم کلام مجھ سے
کہیں پھول سیڑھیوں کے، کہیں جھاڑیاں چھتوں کی

مرے کاغذوں میں شاید کہیں اب بھی سو رہی ہو
کوئی صبح گلستاں کی، کوئی شام پربتوں کی

کہیں دشت دل میں شاید مری راہ تک رہی ہو
وہ قطار جگنوؤں کی، وہ مہک ہری رتوں کی

یہ نہیں کہ دب گئی ہے کہیں گرد روز و شب میں
وہ خلش محبتوں کی، وہ کسک رفاقتوں کی

اپنے بیٹے کے نام

ہمارے بچپنے کی اک چونی میں
خدا جانے ہمارے کتنی ننھی خواہشیں تکمیل پاتی تھیں
پلاؤ اور متنجن سے
چنے کے سوختہ دانے بھلے معلوم ہوتے تھے
وہ سوندھی منگ پھلی اور اس چنے کی دال کی لذت
زباں اور ذہن کے اندر کہیں موجود ہے اب تک
یہ جنگل جن میں رستے، بستیاں اور کارخانے بن گئے ہیں
ہمیں یہ جگنوؤں اور تتلیوں کے شہر لگتے تھے
سجیلے نیل کنٹھوں، فاختاؤں اور ہرے طوطوں کے یہ خرمن

ہمارے خواب کے حیرت کدے اور جادو گھر تھے
ہوا تب اس قدر ٹھنڈی ملائم اور خوشبودار ہوتی تھی
کہ اس میں سانس لے کر روشنی دل میں اترتی تھی
گھروں، گلیوں میں ہمسایوں کے دکھ سکھ مشترک تھے سب
محبت ٹھوس سونے کی طرح سچی کھری تھی تب
تب اس بستی کا ہر فراخ در سونے کا در معلوم ہوتا تھا
جہاں یاقوت اور نیلم گلی کوچوں میں رلتے تھے
ہزاروں در تھے لیکن ایک گھر آنگن میں کھلتے تھے
محرم، عید میلاد النبیﷺ، شبرات سب مل کر مناتے تھے
کسی ماتھے پہ مسلک کا کوئی بل تھا نہ سلوٹ تھی
سبھی اک دوسرے سے پیار کرتے تھے
عقائد اور زبانوں کے تعصب سے ابھی سینے نہ جکڑے تھے
ابھی چاہت کے یہ شفاف آئینے نہ چٹخے تھے
ہوا، بارود کی بو، خون کی خوشبو سے آلودہ نہ تھی اب تک
عبادت گاہ اور مکتب میں اتنے فاصلے بڑھنے نہ پائے تھے
مساجد کے کھلے در آہنی تالوں کے قابو میں نہ آئے تھے
ابھی بندوق برداروں کے نرغے میں
خدا کا نام لینے کی کڑی ساعت نہ آئی تھی
دواتوں میں ابھی تک علم و فن کی روشنائی تھی

ابھی تک تختیوں پر حرفِ حق کی رونمائی تھی
ہم اپنے خوبصورت عہد کے معصوم بچے تھے

O

حسن بیٹے! مگر یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا
تم ایسے عہد میں آئے ہو جب ٹوٹی دواتوں سے
سرِ فرشِ عبادت گہ لہو کے داغ روشن ہیں
بھڑکتے سرخ شعلوں سے مساجد اور دبستانوں کی دیواریں فروزاں ہیں
سرِ دیوار و در اب دہشتوں کے سائے لرزاں ہیں
وہ سرکنڈوں کے جنگل جل چکے جن سے
قلم لکھنے کی خاطر کاٹتے تھے ہم
جہالت کی خلیجیں پاٹتے تھے ہم
وہ جگنو بجھ گئے جو مٹھیوں میں جگمگاتے تھے
وہ رستے کھو گئے جو مکتب و مسجد کو آپس میں ملاتے تھے
ہرے طوطوں کے پر اب آشیانوں میں سلگتے ہیں
گھٹن اور حبس کے اس موسمِ جانکاہ کے باسی
مقفل کھڑکیاں اور بند روشن دان رکھتے ہیں
دیارِ خوف میں اب پھول کلیاں بیچنے والے
کلاشنکوف زیرِ سایہء گلدان رکھتے ہیں

تم ایسے عہد میں آئے ہو جب تحفے میں دینے کو
ہم اپنی جیب میں صحرا نہ نخلستان رکھتے ہیں
مگر اچھے دنوں کے لوٹ آنے کا
ہم اپنے سوختہ دل میں بہت مدھم سا اک امکان رکھتے ہیں
اسی امکان پر ایمان رکھتے ہیں!

O

یہی تھا جانِ من، بالکل ہمارا حال پہلے بھی
یہی ہم سوچتے تھے آج سے کچھ سال پہلے بھی

ردائے خواب سے باہر نہیں نکلے ہیں ہم اب تک
ستاروں سے بھری اوڑھے ہوئے تھے شال پہلے بھی

اسی دامن سے آنسو پونچھتے تھے خلوتوں میں ہم
اسی مٹی میں رلتے تھے ہمارے لال پہلے بھی

در و دیوار ہی سنتے تھے سارے شہر کے دکھڑے
یہی تھا سامعینِ محترم کا کال پہلے بھی

یہی دامن تھا جس کی دھجیوں پر شعر لکھتے تھے
ہمارا شہر میں تھا میرؔ جیسا حال پہلے بھی

یہ عشق آرزو پہلے بھی گلیوں میں پھراتا تھا
گلے کا طوق تھا کم بخت یہ جنجال پہلے بھی

نئی اب کون سی حالات کی صورت نکل آئی
یہی ہم تھے، یہی تم تھے، یہی احوال پہلے بھی

O

ایسا نہیں کہ تیرے بعد اہل کرم نہیں ملے
لوگ تو کم نہیں ملے، لوگوں سے ہم نہیں ملے

ایک ترے فراق کے درد کی بات اور ہے
جن کو نہ سہہ سکے یہ دل، ایسے تو غم نہیں ملے

قصۂ ترک رسم و رہ اس کے سوا ہے اور کیا
مل نہ سکیں طبیعتیں، اپنے قدم نہیں ملے

یہ تو ہوا کہ عشق میں نام بہت کما لیا
خود کو بہت گنوا لیا، دام و درم نہیں ملے

ایسا دیار ہجر نے ہم کو اسیر کر لیا
اور کسی کا ذکر کیا خود کو بھی ہم نہیں ملے

نام وروں کے شہر میں نام بہت ملے مگر
ہم سے گداز دل اسے اہل قلم نہیں ملے

O

چلی ہے شہر میں اب کے ہوا ترکِ تعلق کی
کہیں ہم سے نہ ہو جائے خطا ترکِ تعلق کی

بناوٹ گفتگو میں، گفتگو بھی اکھڑی اکھڑی سی
تعلق رسمی رسمی سا، ادا ترکِ تعلق کی

ہمیں وہ صبر کے اس موڑ تک لانے کا خواہاں ہے
کہ تنگ آ جائیں ہم، مانگیں دعا ترکِ تعلق کی

بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے وہ ترک مراسم کے
اسے ویسے بھی عادت ہے ذرا ترکِ تعلق کی

یہ بندھن ہم نے باندھا تھا سلامت ہم کو رکھنا تھا
بہت کوشش تو اس نے کی سدا ترکِ تعلق کی

وہ ملتا بھی محبت سے ہے لیکن عادتاً ساجدؔ
کئے جاتا ہے باتیں جا بجا ترکِ تعلق کی

O

اپنی صفائی میں کوئی ہم نے بیان نہیں دیا
جل جل کے راکھ ہو گئے پھر بھی دھواں نہیں دیا

کتنی تھی سنگ دل ہوا' جس نے ہم اہل شوق کے
سارے دیے بجھا دیئے اذنِ فغاں نہیں دیا

ایسا نہیں ملا کوئی جس سے بیان حال ہو
ورنہ تو اشتہار دل ہم نے کہاں نہیں دیا

پنجرے کی جالیوں سے کچھ پھول دکھائی دے سکیں
اب کے بہار نے ہمیں ایسا سماں نہیں دیا

کیسے ہیں بدنصیب لوگ' جن کو خدا نے دہر میں
نطق تو کر دیا عطا' حسنِ بیاں نہیں دیا

تخت پہ بیٹھ کر بھی وہ رب سے گلہ گذار ہیں
رنج یہ ہے کہ کیوں انہیں تختِ رواں نہیں دیا

کہاں تھے تم ؟

سو اب آئے ہو تم کھنکھار کے عرض ہنر کرنے؟
سخن کو اور بے توقیر اور نا معتبر کرنے
جب اہل شہر کی آواز پابند سلاسل تھی
قصیدے لکھ رہے جب انائیں بیچنے والے
تجارت کر رہے تھے جب صدائیں بیچنے والے
تو تم اس بھیڑ سے ہٹ کر
ہجوم شہر سے کٹ کر
الگ پہچان لے کر سامنے اہل سخن کے کیوں نہیں آئے؟
بتایا کیوں نہیں تم نے حق و باطل کی اس جنگاہ میں

تم کس کی جانب ہو؟
کہاں ہو تم ؟
کہاں تھے تم ؟
جب ایسی کرسیوں کا مول بھاؤ ہو رہا تھا
جنہیں منصب نہیں تقدیس سے پہچانا جاتا تھا
ہمیشہ معتبر گردانا جاتا تھا
تو اس نیلام عام منصفی کے زرد موسم میں
کہاں تھے تم ؟
جب اپنے دشمنوں کی لاش پر رقصاں تھے دشمن
وفور انبساط فتح میں لاشوں پہ بھنگڑے ڈال کر نغمہ سرا تھے
پس دیوار و در جب وارثوں کی سسکیاں بھی گھٹ گئیں تھیں
جب اللہ کی زمیں پر اس کے بندوں کا لہو
پانی کی صورت بہہ رہا تھا
جب اک لاشے پہ کوئی ''ابا'' ''ابا'' کہہ رہا تھا
تم کہاں تھے؟
جب اک اجلی عبادت گاہ کے فرش مقدس پر
تلاوت کرنے والے بے گناہ معصوم بچوں کے لہو میں
گولیوں کے خول اچھلتے' آگ اگلتے پھر رہے تھے
عبادت کرنے والے آخری سجدے کے عالم میں زمیں پر گر رہے تھے

تم کہاں تھے؟

O

سنہرے تیل کے چشموں کے مالک
ہماری بستیوں میں جب برائے عیش وعشرت خیمہ زن تھے
جب ان کے سامنے صف بستہ خدمت گار کچھ اہل وطن تھے
شکاری جب حواس وہوش اپنے کھو رہے تھے
ہماری بیٹیوں کے آنچلوں کے نقد سودے ہو رہے تھے
گھروں میں بوڑھے مفلس باپ اپنے منہ چھپائے رو رہے تھے
برہنہ جسم جب غرقاب دریا ہو رہے تھے
زباں بندی کی خاطر بے نوا لوگوں کو دھمکایا گیا تھا
جب ان کے منہ میں زر کا زہر ٹپکایا گیا تھا
تم کہاں تھے؟
اگر تم تھے تو کس صف میں کھڑے اس ظلم پر نوحہ کناں تھے؟
تمہارا احتجاج اور اس کے اندر کی توانائی کہاں تھی؟
تمہاری حق پرستی اور سچائی کہاں تھی؟
کہاں تھے تم؟
کہاں تھے؟

O

O

نہ پوچھ ہم سے کہ اس گھر میں کیا ہمارا ہے
اسی میں خوش ہیں کہ حسنِ فضا ہمارا ہے

الگ مزاج ہے اپنا تمام لوگوں سے
تمام قصوں میں قصہ جدا ہمارا ہے

کسی بھی خشت پہ ہر چند حق نہیں رکھتے
مگر یہ شہر بفضلِ خدا ہمارا ہے

ہماری شہرتوں' رسوائیوں کے کیا کہنے
کہ سنگ راہ بھی نام آشنا ہمارا ہے

جلاتے پھرتے ہیں ہم کاغذی گھروں میں چراغ
رہے یہ ڈھنگ' تو حافظ خدا ہمارا ہے

دلوں کے قریۂ بیگانگی میں رہتے ہیں
سو دوستو یہی تازہ پتہ ہمارا ہے

ہمیں یہ آخری خوش فہمیاں نہ لے ڈوبیں
کہ سیل آب شریک نوا ہمارا ہے

بہت ہے شور مگر اطمینان بھی کہ یہاں
کوئی تو ہے جو سخن آشنا ہمارا ہے

جب آنکھیں بولنے لگتی ہیں

کیا وہ ساعت آ پہنچی ہے؟
جب سارے پل بہہ جاتے ہیں
لنگر ہلتے رہ جاتے ہیں
کوئی چپو ہاتھ نہیں آتا
کوئی کشتی ساتھ نہیں دیتی
کیا وہ ساعت آ پہنچی ہے؟

☆

جب لفظوں کی شریانوں میں
تاثیرِ نوا سو جاتی ہے

جب جھوٹ کے کوڑے دانوں میں
ہر سچائی کھو جاتی ہے
جب ہونٹ لرزنے لگتے ہیں
تب آنکھیں بولنے لگتی ہیں

☆

جب آنکھیں بولنے لگتی ہیں
تب روزِ قیامت ہوتا ہے
کیا وہ ساعت آ پہنچی ہے؟

O

ترے کنول، مرے گلاب سب دھوئیں میں کھو گئے
محبتوں کے تھے جو باب سب دھوئیں میں کھو گئے

ہوائے ہجر نے بجھا دیئے ترے چراغ سب
مرے نجوم و ماہتاب سب دھوئیں میں کھو گئے

مری دعائیں، التجائیں سب ہوا میں اڑ گئیں
ترے حروف باریاب سب دھوئیں میں کھو گئے

تہوں سے دل کی شعلہء فراق اس طرح اٹھا
کہ اس کے بعد اپنے خواب سب دھوئیں میں کھو گئے

جلا رہے تھے کاغذی گھروں میں موم بتیاں
ہوا نے کھائے پیچ و تاب سب دھوئیں میں کھو گئے

ہوئیں جو نذرِ آتشِ جنوں تمام راحتیں
مرا قلم تری کتاب سب دھوئیں میں کھو گئے

وہ گھر تو خواب گاہ کے چراغ نے جلا دیا
کہاں کی نیند، کیسے خواب سب دھوئیں میں کھو گئے

O

ترکِ وفا تم کیوں کرتے ہو؟ اتنی کیا بیزاری ہے
ہم نے کوئی شکایت کی ہے؟ بے شک جان ہماری ہے

تم نے خود کو بانٹ دیا ہے کیسے اتنے خانوں میں
سچوں سے بھی دعا سلام ہے، جھوٹوں سے بھی یاری ہے

کیسا ہجر قیامت کا ہے لہو میں شعلے ناچتے ہیں
آنکھیں بند نہیں ہو پاتیں، نیند حواس پہ طاری ہے

تم نے حاصل کر لی ہو گی شاید اپنی منزلِ شوق
ہم تو سرابوں کے راہی ہیں اپنا سفر تو جاری ہے

پتھر دل بے حس لوگوں کو یہ نکتہ کیسے سمجھائیں
عشق میں کیا بے انت نشہ ہے یہ کیسی سرشاری ہے

تم نے کب دیکھی ہے تنہائی اور سناٹے کی آگ
ان شعلوں میں اس دوزخ میں ہم نے عمر گزاری ہے

O

گریاں ہیں اکیلے در و دیوار ہمارے
یہ لاش ہماری' یہ عزادار ہمارے

ہم اپنی طرف لوٹ کے آنے نہیں پائے
حائل تھے کئی راہ میں منجدھار ہمارے

ہر عہد میں دیکھا کہ عدالت تو لگی ہے
آئے نہ کٹہرے میں گنہگار ہمارے

پت جھڑ ہو کہ گلشن میں بہاروں کا سماں ہو
ہر حال میں خوش رہتے ہیں کچھ یار ہمارے

یہ لوگ بدل لیتے ہیں پھر بعد میں کاندھے
کچھ دیر بہت رہتے ہیں غم خوار ہمارے

مٹی کے کھلونوں کی طرح ملتے ہیں ساجدؔ
ہیں خیر سے ارزاں بت پندار ہمارے

O

میں جانتا تھا ایسا بھی اک دور آئے گا
دیوان بھی مرا، تو ہر اک سے چھپائے گا

پوچھے گا جب کوئی ترا دکھ، ازراہِ خلوص
تو اس کو دوسروں کے فسانے سنائے گا

جو بات بھولنے کی ہے یاد آئے گی تجھے
رکھنا ہے جس کو یاد اسے بھول جائے گا

دل سوختہ ملے گا تجھے جب کوئی، کہیں
شدت سے ایک شخص تجھے یاد آئے گا

چھوڑا ہے اس کا شہر فقط اس خیال سے
جب ہم نہ ہوں گے اور وہ کس کو ستائے گا

اس نے بھی کر لیا ہے یہ وعدہ کہ عمر بھر
کچھ بھی ہو، اب وہ دل نہ کسی کا دکھائے گا

O

کوئی تو تھا پسِ ہوا، آخرِ شب کے دشت میں
ہم سے جو ہم کلام تھا آخر شب کے دشت میں

جیسے کسی کی یاد نے سینے پہ ہاتھ رکھ دیا
جیسے کوئی دیا جلا آخر شب کے دشت میں

ایک ہجوم دلبراں، ایک جلوس رفتگاں
بچھڑا تو ہم سے آ ملا آخر شب کے دشت میں

اک جو ملال ہجر تھا صبح طلب سے شام تک
ہم نے کہیں گنوا دیا آخر شب کے دشت میں

ایسا لگا کہ اوس میں بھیگے ہوئے درخت سے
موج ہوا نے کچھ کہا آخر شب کے دشت میں

زینہ دل پہ چاپ سی جانے تھی کس خیال کی
درد تلک کوئی نہ تھا آخر شب کے دشت میں

یہ جو قربتوں کا خمار ہے

مرے اجنبی، مرے آشنا!
تو مصر کہ آئینہ خانے میں
ترے خال وخد کے سوا مجھے
کہیں اور کچھ نہ دکھائی دے
یہ عذابِ طوق ورسن مرا
کسی قصرِ خواب وخیال تک
مرے ذہن کو نہ رسائی دے
مجھے راستہ نہ سجھائی دے
تو یہ چھت جو اپنے سروں پہ ہے

یہ جو بام و در کے حصار ہیں
یہ جو رت جگوں کی بہار ہے
یہ جو قربتوں کا خمار ہے
تو اسی پہ کیا شبِ عمر کی سبھی راحتوں کا مدار ہے؟
مرے اجنبی، مرے آشنا!
کہ دھواں دھواں سی جو ہے فضا
یہ تھمی تھمی سی جو ہے ہوا
یہ جو شور ہے دلِ زار کا
کبھی اس پہ غور کیا ہے کیا؟
مرے اجنبی مرے آشنا
کبھی کاش تجھ سے میں کہہ سکوں
کہ یہ ساعتیں ہیں کٹھن بہت
مرے زخمِ جاں کے طبیب آ
مرے تن بدن سے بھی ربط رکھ
مری روح کے بھی قریب آ
مرے اجنبی مرے آشنا......!

O

یہ دشت، وہ رہ صحرا بھی مجھ کو دیکھنے دو
اب امتحاں کا نتیجہ بھی مجھ کو دیکھنے دو

اس آئینے پہ تمہارا ہی اختیار سہی
کبھی کبھی مرا چہرہ بھی مجھ کو دیکھنے دو

تعین رہ و منزل مجھی کو کرنا ہے
سو، اپنی آنکھ سے رستہ بھی مجھ کو دیکھنے دو

مرے ہی نام سے روشن ہیں بام و در جس کے
اب اس مکاں کا نقشہ بھی مجھ کو دیکھنے دو

شریک رنج سفر تم ضرور ہو لیکن
کوئی تو خواب اکیلا بھی مجھ کو دیکھنے دو

O

سکون درد کو، غم کو دوا بناتی ہے
یہ شاعری ہے، عجب معجزے دکھاتی ہے

کسی کے پاؤں کی آہٹ، کسی کی سرگوشی
ہوائے ہجر، صدائیں بہت سناتی ہے

بدلنے لگتی ہے ہر گام پر سراب کی شکل
ہوائے دشت، بہت صبر آزماتی ہے

اسی سے شکوہ بھی رہتا ہے تلخ گوئی کا
کہ جس سے اپنی طبیعت قرار پاتی ہے

تمہاری مجھ سے ملاقات بھی اچانک تھی
تمہارا مل کے بچھڑنا بھی حادثاتی ہے

کہیں یہ کوئی نئی سازشِ ہوا تو نہیں
کہ کچھ چراغ بچاتی ہے، کچھ بجھاتی ہے

O

کیا دوستوں کا رنج کہ بہتر نہیں ملے
دشمن بھی ہم کو قد کے برابر نہیں ملے

اس بحرِ آرزو میں جو کرتے ہمیں تلاش
اب تک تو ہم کو ایسے شناور نہیں ملے

بس ایسا کچھ ہوا کہ سمجھ میں نہ آ سکا
دل مل گئے، ہمارے مقدر نہیں ملے

ملتے ہیں لوگ لمبی جدائی کے بعد بھی
تم ایسے گم ہوئے کہ پلٹ کر نہیں ملے

لوگوں نے گفتگو میں کریدا بہت ہمیں
ہم خود سے ہمکلام تھے اکثر نہیں ملے

اب کے عجب بہار کا موسم ہمیں ملا
صندل سے جسم، پھول سے پیکر نہیں ملے

آخری گفتگو

یہ تصویریں ہیں
خط ہیں
اور کچھ پرزے ہیں
جن پر تم مجھے پیغام لکھتی تھیں
انہیں محفوظ کرلو
ہاں مگر افسوس
ٹیلی فون پر جو گفتگو

تم مجھ سے کرتی تھیں
انہیں میں تم کو واپس کر نہیں سکتا
جو میری دسترس میں تھا
تمہارے سامنے ہے سب
جو باقی ہے
صدا ہے اب!

O

بھڑک سکتی ہے ظالم آگ، پانی میں نہیں رہنا
تم اپنی شاعرانہ خوش بیانی میں نہیں رہنا

نظر رکھنا کہ اس کے اور کیا کیا اب ارادے ہیں
فقط تم یار جانی، یار جانی میں نہیں رہنا

وہ زندہ آدمی کو بت بنا سکتا ہے، سمجھے تم؟
اسیر اس شوخ کی جادو بیانی میں نہیں رہنا

جہاں تک ساتھ دیں سانسیں وہیں تک لطفِ نغمہ ہے
تر و تازہ یہ لہجہ دورِ ثانی میں نہیں رہنا

ہمارے بعض شعرائے مکرم کا مقولہ ہے
ضعیفی میں جواں رہنا، جوانی میں نہیں رہنا

تم اپنا خود کوئی کردار ساجدؔ منتخب کر لو
گداگر بن کے شاہوں کی کہانی میں نہیں رہنا

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

دشت عمر کی دھوپ میں تشنہ
میلوں پیدل چلتے چلتے
دھوپ اور لُو میں جلتے جلتے
زخمی تلوے ملتے ملتے
جب درماندہ حال مسافر
کسی دوکان بیم ورجا سے
مانگ تانگ کر برف کے قتلے
پھیلے ہوئے دامن میں رکھ کے
اپنے گھر کا رخ کرتا ہے

بڑھ جاتی ہے دھوپ کی حدت
گرد و غبار میں کھو جاتا ہے
رستہ گھر لے جانے والا
دامن خالی ہوتا ہے
برف کی قلمیں بہہ جاتی ہیں
آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

○

خلق خدا کے خوف سے اکثر
جو باتیں ہم کہہ نہیں سکتے
پتھر چونے اور کاغذ کی
یہ دیواریں کہہ جاتی ہیں
آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں!

O

تو نے تو اے رفیق جاں، اور ہی گل کھلا دیئے
بخیہ گری کے شوق میں زخم نئے لگا دیئے

دست ہوا نے ریت پر پہلے بنائے راستے
پھر مرے گھر کے راستے، گھر سے ترے ملا دیئے

کتنی تھی اجنبی فضا، پہلے پہل فراق میں
درد کے اشتراک نے دوست کئی بنا دیئے

آمد یار کی خبر سن کے ہم اہل شوق نے
پلکوں سے گرد صاف کی رستے میں دل بچھا دیئے

پوچھا تھا کیا پسند ہے تم کو مری بیاض میں
اس نے جدائیوں کے شعر چن کے مجھے سنا دیئے

آخری سنگ میل تک سانس اکھڑی چلی مگر
پیش خیال تھا کوئی، ہم نے قدم بڑھا دیئے

ایک ستم ظریف نے صبح طرب کے نام پر
اپنا دیا بچا لیا سب کے دیئے بجھا دیئے

کتنا سخن شناس تھا طعنہ دیا تو یوں دیا
آپ کے فن کے رت جگے ہجر نے جگمگا دیئے

ہمیں آواز دے دینا

اگر دکھ زندگانی کے
تمہیں آزار پہنچائیں
کوئی جلتی ہوئی ساعت، کوئی بجھتا ہوا لمحہ
تمہارے دل پہ دستک دے
تو ہم کو یاد کر لینا
ہمیں آواز دے دینا
ابھی زندہ ہیں ہم اس زندگی کی بیکرانی میں
ابھی تک دے رہے ہیں امتحاں

اس کارگاہ امتحانی میں
ابھی تک مبتلا ہمیں، ہم اسی خواب جوانی میں
تم اپنا کوئی دکھ ہم سے نہیں تو کس سے بانٹو گے؟
کسے آواز دو گے تم؟

O

وہاں سے لوٹتا ہے جست جس گوشے میں کرتے ہیں
ہمیں معلوم ہے پرواز ہم پنجرے میں کرتے ہیں

کوئی صدیاں نہیں لگتیں ہمارے دن بدلنے میں
ہم اپنا فیصلہ بس ایک ہی لمحے میں کرتے ہیں

در و دیوار زنداں سے مخاطب ہو رہے ہیں ہم
وہی کچھ کر رہے ہیں لوگ جو ایسے میں کرتے ہیں

سنی تھی ہم نے بھی شیرینی گفتار کی شہرت
مگر وہ گفتگو کچھ اور ہی لہجے میں کرتے ہیں

بھٹکتے پھر رہے ہیں آج تک اس جرم عصیاں پر
مذمت رہزن و رہبر کی ہم رستے میں کرتے ہیں

یہ صحرا شام تک ساری گلی میں پھیل جاتا ہے
ہم اپنی صبح کا آغاز جس کمرے میں کرتے ہیں

کسی دن ان فضاؤں میں چہکتے دیکھنا ہم کو
ابھی اس شوق کی تکمیل ہم پنجرے میں کرتے ہیں

O

فقط اپنی ضرورت کے لئے غم خوار تھے میرے
برہنہ سر جو زیرِ سایۂ دیوار تھے میرے

کہیں منصف، کہیں مجرم، کہیں بے خانماں تھا میں
ہر اک منظر میں یکسر مختلف کردار تھے میرے

کھلی جب آنکھ میری، اک عجب ہو کا بیاباں تھا
نہ تھے جاروب کش میرے نہ پہرے دار تھے میرے

پلک جھپکی تو ملبے کی طرح بکھرا پڑا تھا میں
کدالیں تھیں انہیں ہاتھوں میں جو معمار تھے میرے

وہ میرے دوست کب تھے جن سے دل کی بات میں کرتا
فقط دفتر کی میزوں پر شریک کار تھے میرے

وہ اپنے جاہ و منصب کی گواہی لینے آئے ہیں
ابھی کل تک جو ساجدؔ مورچھل بردار تھے میرے

O

کیا وہاں کام مری طاقتِ گفتار کا تھا
میرا تو رول ہی خاموش اداکار کا تھا

دھوپ میں کیسا غنیمت تھا، ہمیں جانتے ہیں
اتنا مدھم سا جو سایہ تری دیوار کا تھا

قدر و قیمت مری تحریر کی کیسے ہوتی
میں مصاحب تھا نہ منشی کسی دربار کا تھا

میرے بچے یونہی بے تاب ہوئے پھرتے تھے
صحن میں عکس فقط شاخِ ثمر دار کا تھا

ماں! اچانک ترے ہاتھوں نے مجھے تھام لیا
یاد آتا ہے کہ منظر کسی منجدھار کا تھا

بات کرتا تھا وہ ہم رتبہ رفیقوں کی طرح
جس کی پاپوش تلے پر مری دستار کا تھا

کسی کم ظرف کے ہاتھوں نہیں کھائی ہے شکست
خوش میں اس پر ہوں کہ دشمن مرے معیار کا تھا

O

حروف آگہی تھے بے کس و لاچار کیا کرتے
کلاشنکوف کے آگے مرے اشعار کیا کرتے

جہاں گولی سے حرف جسم پر اعراب لگتے ہیں
وہاں منطق، دلیلیں، فلسفے، افکار کیا کرتے

جنہیں اپنی پرستش سے کبھی فرصت نہیں ملتی
ہم ان کے روبرو اپنا بت پندار کیا کرتے

نصیحت کرنے والوں کو بھی خوش رکھنا ضروری تھا
جو میں اپنی سی کرتا یہ ہدایت کار کیا کرتے

دلیلیں دے رہے تھے لوگ اپنی قامت فن کی
ہمیں نے سادھ لی چپ، حجتیں بیکار کیا کرتے

مکینوں کو مکینوں کی طرح پایا نہیں ہم نے
سو اس بستی میں تحسین در و دیوار کیا کرتے

ہماری کشتیء امید کا انجام ظاہر تھا
مخالف تھی ہوا، ٹوٹے ہوئے پتوار کیا کرتے

اگر ہوتے بہادر شاہ کے عہد سخن میں ہم
یہی دو حرف لکھتے اور کاروبار کیا کرتے

O

حسنِ بیان قصر کا ایسا بھی اہتمام کیا
گھر تو مکیں کے دم سے ہے ذکر فراز بام کیا

ایک ہمی پہ کس لئے تیری نگاہ التفات
عمر رواں! تجھے کوئی اور نہیں ہے کام کیا

کوئی تو آسرا رہے' خواب وصال ہی سہی
گریۂ ہجر کب تلک' روئیں اسے مدام کیا

چاہئے اک نگاہ شوق' ورنہ بساط دہر پہ
میری خلش کے نرخ کیا تیری تڑپ کے دام کیا

مجھ سے حساب روز و شب' اے میری زندگی نہ مانگ
سوختہ دل کی صبح کیا' قریہ نشیں کی شام کیا

اہل نظر کی دین ہے اپنا یہ اعتبار فن
ورنہ ہمارے حرف کیا' ورنہ ہمارا نام کیا

ترا ہجر ہی پیارا ہے

وصل کے موسم کا کیا کہنا
لمحہ بھر کے سکھ کے بدلے
پھر وہی حال ہمارا ہے
آنکھوں میں ساون کی شامیں
چہرہ درد کا مارا ہے
پلکوں کی ڈھلوان پہ لرزاں
اشک کا دھندلا تارا ہے
مت کر ہم سے وصل کے وعدے
کب اس کیف کا یارا ہے

اور بڑھا دے ہجر کی تلخی
یہی تو ایک سہارا ہے
تجھ سے دور ہی اچھے ہیں ہم
جو بھی حال ہمارا ہے
کیا لینا ہے تجھ سے مل کر
تیرا ہجر ہی پیارا ہے!

O

صاف جب تک نہ ترے ذہن کے جالے ہوں گے
کیسے تحریر محبت کے مقالے ہوں گے

کیا ہمیں نیند بھی آئے گی تری خواہش پر؟
کیا فقط خواب ہی ہم دیکھنے والے ہوں گے

اس طرح دشتِ محبت سے گذر جاؤں گا
جسم زخمی نہ مرے پاؤں میں چھالے ہوں گے

کیسے ہو گی مری چاہت کی امانت محفوظ
اس نے اب تک مرے خط کیسے سنبھالے ہوں گے

گھر کے اندر بھی کوئی مجھ پہ توجہ دیتا
گھر کے باہر تو کئی چاہنے والے ہوں گے

جب مسیحائی کی تاریخ لکھی جائے گی
اس میں شامل مرے زخموں کے حوالے ہوں گے

O

تری طلب نے ہمیں کس قدر خراب کیا
کہ ہم نے آپ ہی اپنا سفر خراب کیا

جو کم نظر ہیں ہمیں ان پہ اعتراض نہیں
ہمیں تو آپ نے اہلِ نظر خراب کیا

کوئی فراق سی راحت، کوئی وصال سا رنج
اسی جنوں نے ہمیں دربدر خراب کیا

شریکِ رنجِ سفر ہو کے کیا ملا تجھ کو
بلا جواز ہمارا سفر خراب کیا

جو دل میں آئی اسے بام و در پہ لکھ ڈالا
تمہاری طبعِ رواں نے یہ گھر خراب کیا

حسین گھر تھے سمندر کے سامنے لیکن
ہوائے نم نے رخِ بام و در خراب کیا

ہمیں نکال کے بزمِ غزل سے کیا نکلا
عدوئے شعر نے بابِ ہنر خراب کیا

O

ہیں یوں تو بہت آپ کی قربت سے بھی محروم
ہم لوگ کہ ہیں، اپنی رفاقت سے بھی محروم

ہر لمحہ ہیں اک ہجر مسلسل کی فضا میں
پھر بھی ہیں، غمِ ہجر کی راحت سے بھی محروم

صحرا کی طرح ہے کہ شجر ہیں نہ کہیں پھول
جو ذہن ہے شعروں کی لطافت سے بھی محروم

اف، اتنی تگ و تاز کے باوصف بھی کچھ لوگ
شہرت سے بھی محروم، ہیں عزت سے بھی محروم

مانگی ہوئی بیساکھیاں کچھ کام نہ آئیں
اور ہو گئے اصل قد و قامت سے بھی محروم

حیرت ہے کسی نے بھی نوازا نہیں ان کو؟
جاہل بھی ہیں، دستارِ فضیلت سے بھی محروم

O

صاف تو کہہ رہے ہیں ہم اپنی مراد گھر سے ہے
تیرا معاملہ مگر شوکتِ بام و در سے ہے

جانے بہانہ جُو رفیق کون سا گل کھلائے کب
راہ میں مشکلیں بھی ہیں، خوف بھی ہم سفر سے ہے

بچھڑے تو کیا بتائیں گے شہرِ ادا شناس کو
سو، تجھ سے ربط وضبط بھی خلق خدا کے ڈر سے ہے

پھر بھی بھٹک رہا ہے تو، شہر ہوا کے اجنبی!
اتنی جو روشنی یہاں میرے چراغِ در سے ہے

وہ بھی گلہ گزار ہیں میرے سخن کے شور سے
جن کا ثبات آگہی میرے غمِ ہنر سے ہے

ایک دُعا

(عروس البلاد کراچی کے پس منظر میں)

رحم کر اے خدا،
اے خدا رحم کر
جل چکے اپنے گھر
اپنے ننھے فرشتوں کے پر
بام و در
خواب دیکھے تھے جن انکھڑیوں نے کبھی
صحنِ گلزار کے
ان میں اب گرد ہے اور دھوئیں میں کھنڈر

رحم کر اے خدا'

اے خدا رحم کر

آس کا کوئی جھونکا' خوشی کی خبر!

جو شگوفوں کے چہروں سے بچھڑی ہوئی

مسکراہٹ کا در کھول دے

اور بارود کے اس دھوئیں میں

سجل خوشبوئیں گھول دے

میرے بچوں کی سہمی ہوئی آنکھ کو

صبح امید کی روشنی بخش دے

شہر کے بے اماں مضطرب باسیوں کے

سلگتے ہوئے ذہن کو تازگی بخش دے

چھین لے مجھ سے میری توانائیاں

اس کے بدلے میں اجڑے ہوئے شہر کو

زندگی بخش دے!

O

بیٹھے بٹھائے لوگ مصیبت میں پڑ گئے

بنیاد کیا ہلی کہ گڑھے چھت میں پڑ گئے

کیسا علاج زخم تمنا' کہاں کا چین

یہ آپ لوگ کون سی زحمت میں پڑ گئے

ہم مشکلوں سے بھاگنے والے بہانہ جو

عقدہ کشائیوں کی اذیت میں پڑ گئے

شوقِ سفر میں کون ٹھہرتا کہ دیکھتا
وہ آبلے جو پائے رفاقت میں پڑ گئے

اس نے وفا کے نام پہ کی ایسی گفتگو
ہم اہل شوق ورطہء حیرت میں پڑ گئے

پھر آبروئے جبہ و دستار بھی گئی
جب پاؤں خارزارِ سیاست میں پڑ گئے

اس نے ثبوت زخم جگر کیا طلب کیا
سب عافیت پسند مصیبت میں پڑ گئے

O

ہر روز سوچتا ہوں مقدر بناؤں گا
ترکِ سفر کروں گا کہیں گھر بناؤں گا

اس کہکشاں سے مانگ سجاؤں گا میں تری
اس ماہتاب کو ترا جھومر بناؤں گا

سب موسموں کے عکس دکھاؤں گا ایک ساتھ
کاغذ پہ جب کبھی ترا پیکر بناؤں گا

پیش نظر جو ہے اسے کیا نقش و رنگ دوں
جو سامنے نہیں ہے وہ منظر بناؤں گا

یہ ان کی کشتیوں کی گزرگاہ آب ہے
اپنے لئے الگ میں سمندر بناؤں گا

آئے گی دشت سے مری آواز بازگشت
ان گنگ وادیوں کو سخنور بناؤں گا

گر چشم و پا نے چھوڑ دیا اس سفر میں ساتھ
بیٹے کو اپنی راہ کا رہبر بناؤں گا

O

یہ رات بے نوید ہے مزید عرض کیا کریں
سحر کی کم امید ہے مزید عرض کیا کریں

ان آندھیوں میں ہم اسیر بام و در ہوئے، جہاں
گھٹن بہت شدید ہے مزید عرض کیا کریں

شکستہ ٹہنیوں پہ بھی کھلیں گے پھول خیر سے
شنید ہی شنید ہے مزید عرض کیا کریں

وہ فصلِ گل جب آئے گی تو دیکھئے گا آپ بھی
ابھی تو شوق دید ہے مزید عرض کیا کریں

وہی حسینؑ بے وطن ہے تشنہ لب فرات پر
وہی صف یزید ہے مزید عرض کیا کریں

قفس کی جالیوں سے دیکھتے ہیں رونق چمن
یہی ہماری عید ہے مزید عرض کیا کریں

دلیلِ حق جو لا رہے ہیں اپنے صاحبانِ فن
سو عقل سے بعید ہے مزید عرض کیا کریں

ٹھہر کے رت جگوں کی داستان کیا کریں بیاں
ابھی سفر مزید ہے مزید عرض کیا کریں

O

اندھیری شب میں لئے روشنی نکل آیا
ادھر یہ کون دوانہ سخی نکل آیا

یہ کیا کہ تجھ سے رہ و رسم کے حوالے پر
تمام شہر مرا اجنبی نکل آیا

جو میں نے زور دیا اپنی بے گناہی پر
تو سنگِ رہ بھی ترا مدعی نکل آیا

مجھے تو راہ نہ دیتا تمام عمر کوئی
قطار چھوڑ کے میں آپ ہی نکل آیا

کئی چراغ بکف بے دیار لوگوں سے
ہمارا سلسلۂ دوستی نکل آیا

پہن کے میرے خدوخال، ماہ و سال تمام
کل آئینے سے نیا آدمی نکل آیا

آئینے کے سامنے

پروردگار نے یہ کیا مجھ پہ لطفِ خاص
میرے لئے دکھوں کو بھی تسخیر کر دیا
شیشہ مثال تھے مرے اوراقِ شاعری
میں نے بھی اپنے آپ کو تحریر کر دیا

اعزاز

سلام اس ماں کو
جس کے آخری بیٹے کو دشمن نے
تہِ تیغ ستم کر کے
دیا گل کر دیا ہے ایک کنبے کا
مگر ماں پھر بھی کہتی ہے:
خداوندا'
مجھے کاش اور بھی بیٹے دیئے ہوتے
انہیں بھی یہ مقام و عزت و توقیر مل جاتی!

O

میں تو اپنے خوابوں کا دربار لگائے بیٹھا تھا
دشمن میرے پہلو سے تلوار لگائے بیٹھا تھا

اسی نے دروازہ کھولا تھا مرے عدو کی دستک پر
میں ڈیوڑھی میں جس کو پہریدار لگائے بیٹھا تھا

اب دنیا مظلوم سمجھ کر کیا اس کی توصیف کرے
کل تک جو کلغی والی دستار لگائے بیٹھا تھا

ڈال ڈال پر اڑنے والے پنچھی کس کے میت ہوئے
میں ناحق اپنے دل کو آزار لگائے بیٹھا تھا

میرے کونسے خواب اونچے تھے میں تو کونے کھدرے میں
چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا انبار لگائے بیٹھا تھا

کون مسیحا پرسش حال کی خاطر میرے پاس آیا
میں جو اپنے زخموں کا بازار لگائے بیٹھا تھا

O

کیوں ہے ہر شعر لہو رنگ تجھے کیا معلوم
میرے جذبات کی فرہنگ تجھے کیا معلوم

پیاس کیسی ہے، لہو دل کا طلب کرتی ہے؟
زرد کیونکر ہے مرا رنگ تجھے کیا معلوم

لوگ اک سادہ سی دستار کے دشمن کیوں؟
مجھ پہ کیوں اٹھتا ہے ہر سنگ تجھے کیا معلوم

اک طرف عشق، ادھر بھوک کے بے انت عذاب
دو محاذوں پہ ہے یہ جنگ تجھے کیا معلوم

کس لئے لوگ اڑاتے تھے مرے فن کا مذاق
کس لئے لوگ ہیں اب دنگ تجھے کیا معلوم

کتنے دکھ سہتا ہوں تب ایک غزل کہتا ہوں
میرے دن، رات کا آہنگ تجھے کیا معلوم

O

نہیں کہ منزلِ قلب و نظر ہے اور کوئی
وہی سفر ہے مگر رہگذر ہے اور کوئی

کسی کے زخم ہیں کوئی بھگت رہا ہے عذاب
کسی کا کاسہ ہے دریوزہ گر ہے اور کوئی

دلِ حزیں، ترا ان قاتلوں سے کیا رشتہ
مرے قتیل، ترا چارہ گر ہے اور کوئی

مجھے نکال، نمائش گہ رفاقت سے
یہ میرے لوگ نہیں میرا گھر ہے اور کوئی

فریبِ منزلِ آشفتگی کا خوف نہیں
ہم ایسے آبلہ پاؤں کو ڈر ہے اور کوئی

یہ اس کی بولتی آنکھوں کی گفتگو سے کھلا
ہم اعتبار سہی، معتبر ہے اور کوئی

پاتال

میں وسعتِ آفاق کا شاعر تھا مگر تم
نفرت کے سلگتے ہوئے پاتال میں لا کر
اب مجھ سے مرا نام و نسب پوچھ رہے ہو

○..........○

تم طعنہ بہ لب اس لئے ٹھہرے کہ مرا دل
آلودۂ تکمیل ہوس کیوں نہیں نکلا؟......
اس دھوپ میں جلنے کا صلہ کیوں نہیں مانگا
میں بندۂ تحریک نفس کیوں نہیں نکلا؟

اب پوچھ رہے ہو کہ مرے کون تھے اجداد؟
کس شہر کی مٹی سے اٹھی ہے مری بنیاد؟......
خود کر کے حقارت سے مجھے مائلِ فریاد......
اب وحشتِ گریہ کا سبب پوچھ رہے ہو؟
اے سنگ بکف، زہر بہ لب گھر کے مکینو!
اس خاک سے نسبت ہے مجھے تم سے زیادہ
اس ماں سے محبت ہے مجھے تم سے زیادہ!

O..........O

اب اور کوئی طعنہ و دشنام نکالو
یا بابِ حقارت سے مرا نام نکالو!

O

ہماری بستیوں میں آ چھپے ہیں ناگ بابا جی
اب ان کے زہر کا تریاق ہے بس آگ بابا جی

سراسیمہ ہے خلقت حفظ جان و مال کی خاطر
کہاں کی بین بابا جی، کہاں کا راگ بابا جی

اسی منظر میں تاحد نظر تھے پھول سرسوں کے
جہاں پھیلی ہوئی ہے نفرتوں کی آگ بابا جی

جھلس کر رہ گئے گندم کے دانے اتنا مینہ برسا
نہیں باقی بچا لقمہ برابر ساگ بابا جی

تعلق میں توازن کس طرح پیدا کیا جائے
ہم اہل درد سادہ دل، زمانہ گھاگ بابا جی

بہت اپنے لہو سے اس چمن کی آبیاری کی
اگر کلیاں نہیں کھلتیں، ہمارے بھاگ بابا جی

طلوع

اسی کُوفے کی مٹی سے
ابھی وہ دل شکستہ، جاں تپیدہ، چاند سی لڑکی
طلوع ہوگی
جو گہری چادر ظلمات چہروں سے ہٹائے گی
بہت بکھرے ہوئے ٹوٹے ہوئے سنسار کی ڈھارس بندھائے گی
شکستہ پا امیدوں کو سہارا دے کے
ملبے سے اٹھائے گی
وہ لڑکی جلد آئے گی

ابھی آئے گی آنچل میں لئے ذرات تاروں کے
معطّر، تازہ تر کچھ پھول آئندہ بہاروں کے
وہ اپنی مٹھیاں بھر بھر کے ان راہوں پہ وارے گی
جہاں آنکھیں گنوا کر سو رہے ہیں جاگنے والے
کسی دہلیز پر آواز کا سورج اتارے گی
کوئی ٹوٹا ہوا زینہ ستاروں سے سنوارے گی
یہ سب تاریکیاں دامن میں بھر کے
کئی چہروں کے آئینے نکھارے گی
پھر اپنی عمر اس کوفے کے اک تاریک زنداں میں گزارے گی
اگر خوش قسمتی سے بچ گئی تاریک زنداں سے
تو بہرے تیر اندازوں کے نرغے میں
سسکتی آخری سانسیں بڑی تکلیف سے لے گی
کہ ہم سچ بولنے والوں کو زندہ رکھ نہیں سکتے
وہ مقتل سے سلامت عین ممکن ہے نکل آئے
مگر بچ کر کہاں جائے گی آخر؟
سگانِ راہ استقبال کو تیار بیٹھے ہیں!

اے میرے قارئین

ہر اچھی بات سوچی جا چکی ہے
ہر اچھا شعر لکھا جا چکا ہے
برسنا تھا جنہیں، برسے وہ بادل
پگھلنا تھا جنہیں پگھلیں وہ شمعیں
سلگنا تھا جنہیں سلگیں وہ آنکھیں
تو پھر اے قارئین حرف و معنیٰ!
تمہیں ہم کیا نیا قصہ سنائیں؟

O

جو باتیں آج کل ہم لکھ رہے ہیں
انہیں لکھنے کے موسم جا چکے ہیں

جنہیں ہم لکھ رہے ہیں بھونڈے پن سے
وہ اس سے پہلے لکھے جا چکے ہیں
کتابیں خوبصورت چھپ رہی ہیں
مگر اب قارئین اکتا چکے ہیں
جہاں تھی راگ درباری کی محفل
وہاں اب پاپ سنگر آ چکے ہیں
مگر مہدی حسن، مہدی حسن ہے
کہ تاثیرِ سخن ہی اصل فن ہے
یہی ایثار، تفسیرِ سخن ہے
کہ کاغذ پر لہو ٹپکا رہے ہیں
سو اب تک دادِ فن ہم پا رہے ہیں

اعتراف

عزیزانِ گرامی قدر!
اکثر واقعاتِ کربلا سن کر
ہمارا دل پگھلتا ہے
ہمارا بس نہیں چلتا کہ ماہ و سال کا پہیہ
گھما کر تیز تر، معکوس، جا پہنچیں

کنارِ آبِ جوئے نینوا، خنجر بکف، تنہا
صفِ اعداء کے آگے جا کے للکاریں کہ آؤ ظالمو دیکھو
حسینؓ ابنِ علیؑ تنہا نہیں
اس معرکے میں ہم بھی مثلِ خاکِ پائے سیدِ ابرار شامل ہیں

ہمیں بھی افتخار خدمت شبیرؑ حاصل ہے
ہمیں بے وقعت و بے نام مت جانو
ہمارا جذبہء ایمان کامل ہے
یقیناً یہ صدائے حق
امیر لشکر باطل کو نا مرغوب تر ہوتی
سو انجام تن خستہ' عزیزان گرامی قدر ظاہر ہے!
اسی انجام کے ڈر سے
عزیزانِ گرامی قدر!
چودہ سو برس سے ہم
ردائے خامشی اوڑھے
لبوں پہ قفل ہائے مصلحت ڈالے
ہر عہد ناروا کے جبر و استبداد کے آگے
نگوں سر ہیں
اگر لب کھولتے بھی ہیں
اگر کچھ بولتے بھی ہیں
تو رنگ سرخی رخسار جاناں کے حوالے سے
وصال یار' جشن موسم گل' مدحت شاہاں
یہی بس اپنے موضوعاتِ فکر و فن کے دھارے ہیں
جہاں دن ہو نکلتے ہیں اور راتیں آہ بھرتی ہیں

وہیں خیمے ہمارے ہیں
ہم اہل بیتؑ کی تقلید میں ہر ظلم کے آگے
مثال کوہ' ڈٹ جانے کی خواہش دل میں رکھتے ہیں
مگر اپنی بیاضیں حاکم اعلیٰ کی اس محفل میں رکھتے ہیں
جہاں ہم ایسے کچھ راگی
سخن کی انجمن میں راگنے والے
شکستہ جان و تن پر جبر کر کے جاگنے والے
لفافوں کے تعاقب میں' مسلسل بھاگنے والے
سخن پیشہ' اپاہج' طالبان داد و زر' الفاظ کے تاجر
غبار سال و مہ میں اپنا بستہ چھوڑ آئے ہیں
جدھر کا قصد آغاز سفر کی شرط ٹھہرا تھا
اسی منزل اسی بستی کا رستہ چھوڑ آئے ہیں
سو انجام تن خستہ' عزیزانِ گرامی قدر ظاہر ہے!

☆

O

معاملات عجب ہیں معاملہ کیا ہے
غزل تو خیر غزل ہے غزل نما کیا ہے

یہ کیا ہجوم ہے آشفتگی کے کوچے میں
بنامِ فن یہ تماشہ مرے خدا کیا ہے

یہ گل فروش کا مرقد ہے اور اس پہ کہیں
کوئی گلاب نہیں ہے یہ ماجرا کیا ہے

کوئی چراغ بکف اور کوئی ستارہ بکف
کسی کو علم نہیں سازشِ ہوا کیا ہے

سبھی کی اپنی گرامر ہے طوطی خانے میں
میں کس زباں میں کہوں میرا مسئلہ کیا ہے

تیرے عدو کو ضرورت ہے اب سہارے کی
گلے لگا لے اسے بڑھ کے، دیکھتا کیا ہے

O

(نذرِ وطن)

ترے وجود سے پہلے دھواں تھا خواب مثال
یہ میں کہ خواب تھا اور بیکراں تھا خواب مثال

مرے گواہ در و بام تھے شبِ مہتاب
مرا عدالتِ دل میں بیاں تھا خواب مثال

مرے یہ پھول مری نیند میں مہکتے تھے
یہ میرا باغ مرا آشیاں تھا خواب مثال

کبھی یہاں مری پرواز تھی درونِ قفس
مری یہ چھت یہ مرا آسماں تھا خواب مثال

میں سر برہنہ کڑی دھوپ کا مسافر تھا
یہ نکہتوں کی فضا، یہ سماں تھا خواب مثال

میں بے دیار تھا سرما کی بارشوں کا ہدف
یہ تیری گود ترا سائباں تھا خواب مثال

تری نوائے صداقت نے مجھ کو حرف دیئے
میں تھا ضرور، مگر بے زباں تھا خواب مثال

آئینے کے روبرو

کیوں مذاق کرتے ہو
فن کے آستانے میں!
تم تو کھوٹا سکہ تھے
وقت کے خزانے میں
ہر یزید کو پوجا
تم نے ہر زمانے میں
اپنا نام لکھوا کر
شاعروں کے خانے میں
عمر کاٹ دی تم نے
شہرتیں کمانے میں
فن کی بات کرتے ہو
کیوں مذاق کرتے ہو

☆

تم نے ظلم کی ہر شب
سیج پر گزاری ہے
جھوٹ کے پلندوں میں
سچ کی ڈینگ ماری ہے
ہر چمکتے سورج کی
آرتی اتاری ہے

☆

ہجو شب نہیں لکھتے
وقت ٹالنے والے
مصلحت کے سانچے میں
خود کو ڈھالنے والے
دیکھ کر ہوا کا رخ
رہ نکالنے والے
شاعری کے پردے میں
پیٹ پالنے والے
تم بھی ان میں شامل ہو!

☆

مدحتیں رقم کرکے
مختلف خداؤں کی
چاند کھینچ لاتے ہو
جیب سے خلاؤں کی
تم چراغ اور تم سے
دوستی ہواؤں کی!

☆

تہمت سخن پھر بھی
یار، خود پہ دھرتے ہو
بات بات پر یونہی
سرد آہ بھرتے ہو
ایسی کیا مصیبت ہے
کیوں یہ روپ بھرتے ہو
شعر و فن کے پردے میں
کیوں مذاق کرتے ہو

☆

تم زمین کے باسی
آسماں کے طالب ہو
مسندوں کے سائے میں
حفظ جاں کے طالب ہو
ہر چمکتے خنجر سے
تم اماں کے طالب ہو

☆

صاف کیوں نہیں کہتے
نام چاہئے تم کو
صبح کے لبادے میں
شام چاہئے تم کو
عشق ہو کہ مزدوری
دام چاہئے تم کو

☆

سلام

سلام ان پہ جو تاب سخن نہیں رکھتے
کوئی ہجوم کوئی انجمن نہیں رکھتے

☆

سلگتے رہتے ہیں مانندِ چوبِ خشک، سدا
وہ تن کہ جن پہ ہے خاکِ الم کی زرد قبا
وہ دل کہ جن کے مقدر میں ہے عذابِ وفا
وہ لب کہ جن کا نصیبہ ہے التماسِ دعا

انہی لبوں کو سلامِ خلوص جاں پہنچے
انہی دلوں کو سلامِ سخنوراں پہنچے

☆

وہ آرزو جسے پیرایۂ ہنر نہ ملا
وہ زخم جن کی جراحت کو چارہ گر نہ ملا
وہ داغ جن کو کوئی صاحبِ نظر نہ ملا
وہ کرب جاں کہ جسے حرفِ معتبر نہ ملا

☆

سلام ان پہ جو زندہ ہیں رنج سہتے ہیں
مگر نہ گریہ کناں ہیں نہ شعر کہتے ہیں!

O

O

یہ جو اب وحشتیں ہیں بھائی صاحب
مرض کی شدتیں ہیں بھائی صاحب

ستارے ٹوٹتے کیوں جا رہے ہیں؟
یہ کیسی ساعتیں ہیں بھائی صاحب

غزل کہتے مسلسل جاگتے ہیں
عجب بد عادتیں ہیں بھائی صاحب

یہ بے ترتیب کاغذ چھیڑیے مت
انہیں میں نعمتیں ہیں بھائی صاحب

بہت خوش ہیں جدا ہو کر وہ ہم سے
ہمیں بھی راحتیں ہیں بھائی صاحب

کسی الجھن میں پڑنا چاہتے ہیں
ہمیں کچھ فرصتیں ہیں بھائی صاحب

شکستہ ہو رہے ہیں ان دنوں ہم
بہت سی حاجتیں ہیں بھائی صاحب

کوئی اک آدھ قضیہ ہو تو روئیں
ہزاروں کلفتیں ہیں بھائی صاحب

یہ افسانے سنے گا کون ہم سے
کسے اب فرصتیں ہیں بھائی صاحب

یہ کیسی دوریاں ہیں قبلہ گاہی
یہ کیسی قربتیں ہیں بھائی صاحب

ہدائت

مہذب گھر کے کتے
قیمتی گدّوں پہ سوتے ہیں
انہیں خوراک میں بادام پستے گوشت کے قتلے
ملائی دودھ کے ڈبے اور ایسی ان گنت چیزیں
فراوانی سے ملتی ہیں
انہیں سیریں کرانے کے لئے ان کے ٹرینز کو

ہدائت ہے
کہ جب ان قیمتی کتوں کو ٹہلانے وہ لے جائیں
تو ان رستوں سے مت گذریں
جہاں آوارہ بھوکے اور بدتہذیب کتے دندناتے ہیں!

O

O

کہاں جائیں کہ بزم آرائیاں سب ایک جیسی ہیں
ہماری شہرتیں رسوائیاں سب ایک جیسی ہیں

ہمارے شہر کی گلیوں میں بہتے ہیں کئی دریا
سبھی گہرے ہیں اور گہرائیاں سب ایک جیسی ہیں

فقط ناموں کی تبدیلی سے کب فطرت بدلتی ہے
رقیبوں کی کرم فرمائیاں سب ایک جیسی ہیں

کسی نے تبصرہ جھوٹے گواہوں پر کیا ہے یوں
کہ سب سچے ہیں اور سچائیاں سب ایک جیسی ہیں

جہالت دیکھ کر شرما رہی ہے ان کی دانش کو
کہ جن کی منطقیں دانائیاں سب ایک جیسی ہیں

ہم اپنے ساتھ لمحہ بھر کہیں رہتے نہیں ساجدؔ
ہماری محفلیں تنہائیاں سب ایک جیسی ہیں

O

وہی دشت ہے، وہی خار و خس، یہ بہار کیسی بہار ہے
کسی شاخسارِ امید پر کوئی پھول تک تو کھلا نہیں

پس کارواں، سرِ رہ گذر، میں شکستہ پا ہوں تو اس لئے
کہ قدم تو سب سے ملا لئے پہ یہ دل کسی سے ملا نہیں

دل سوختہ کو نہیں ملا وہ فروغ عمر کے باب میں
یہ چراغ اتنا جلا نہیں، یہ گلاب اتنا کھلا نہیں

مری واپسی کی سند نہیں مگر اک ذرا سی امید ہے
وہ رفیقِ راہِ سفر بنے تو سفر یہ اتنا کڑا نہیں

مرے اعتبارؔ، بنامِ فن اسے کیوں غزل میں عیاں کیا
جو ہے پاس خاطرِ عشق تھا وہ بھر بھی تو نے رکھا نہیں

پُل

یہ پل میرے دنیا میں آنے سے پہلے
انہی ریل کی پٹڑیوں پر کھڑا تھا
ہزاروں دھواں چھوڑتے شنٹ کرتے ہوئے انجنوں کی تپش سہہ چکا تھا
ہزاروں ٹرینوں کے چلتے ہوئے تیز مدھم رگڑ دار پہیوں سے احوال دل کہہ چکا تھا
ابھی تک انہی ریل کی پٹڑیوں پر کھڑا ہے

☆

130

کئی بار میں سیڑھیاں چڑھ اتر کے
اسی پل کے سر سے گزر کر
کبھی اپنے مکتب، کبھی گھر گیا ہوں
مرے بچپنے میں یہ پل ایک بستی کے مانند تھا
یہاں دور تک سرہی سر تھے بہر سو
ستونوں سے لگ کر خدا نام پر ریزگاری کے طالب بھکاری
تعفن زدہ چیتھڑوں میں لپیٹے ہوئے اپنی لاشیں
ابھی تک انہیں کونوں کھدروں میں نوحہ کناں ہیں
جہاں میرے بچپن میں کاسہ بکف تھے
وہ کاسے کہ جن میں
وہ چاء پیتے تھے، بھیک لیتے تھے اور تیز بارش میں سر ڈھانپتے تھے
یہ پل مجھ کو بچپن میں لگتا تھا اونچا
زمیں سے فلک تک معلق سا رستہ
مجھے خوف آتا تھا چلتے ہوئے ہر قدم پر
کہیں پیش منظر سے میں ہٹ نہ جاؤں
پھسل کر کسی ریل گاڑی کے پہیوں تلے کٹ نہ جاؤں
مگر اب کے اس پل پر چڑھ کے
میں کیا دیکھتا ہوں
کہ چاہوں تو ہاتھوں کو نیچے بڑھا کر زمیں کی سم آلود مٹی اٹھالوں

131

چمکتی ہوئی پٹڑیوں پر لکیریں بنالوں
میں حیرت زدہ سوچتا ہوں کہ یہ کیا ہوا ہے
مرا قد بڑھا ہے کہ پل جھک چکا ہے؟

O

سال کے اختتام پر

یہ سال بھی آخر بیت گیا
کچھ ٹیسیں یادیں خواب لئے
کچھ کلیاں، چند گلاب لئے
کچھ انکھڑیاں پر آب لئے

☆

کچھ جلتے دن، کالی راتیں
کچھ سچے دکھ جھوٹی باتیں
کچھ تپتی رُتیں کچھ برساتیں

☆

کسی یارِ عزیز کا دکھ پیارا
کسی چھت پہ امیدوں کا تارا
کوئی تنہا شاعر دکھیارا
جس پہ ہنستا تھا جگ سارا

☆

اس شاعر نے جو حرف لکھے
اس میں تری یاد کے سائے تھے
وہ لوگ بھی آخر لوٹ گئے
جو صدیوں پار سے آئے تھے

☆

ان ہنستے بستے لوگوں نے
مرے سارے دکھ اپنائے تھے
پھر میں نے یاد کی مٹی میں
زخمی لمحے دفنائے تھے

☆

یہ سال بھی آخر بیت گیا

☆

O

تمغۂ تہمتِ دگر، دل پہ سجا کے آ گئے
پھر ترے شہر میں گئے، نام کما کے آ گئے

دل کا چراغ لے کے ہم، گھر سے چلے تھے شام کو
صبح سے پہلے راہ میں، شہر ہوا کے آ گئے

بھیڑ میں بھی الگ رکھی اپنی متاعِ خال و خد
یہ تو نہیں ہوا کہ ہم چہرہ گنوا کے آ گئے

تھا ابھی رہ میں قافلہ اور ترے شکستہ پا
آخری سنگ میل کو ہاتھ لگا کے آ گئے

تیرا سلوک دیکھ کر دل تو بہت دُکھا مگر
لب پہ مگر تمام تر حرف دعا کے آ گئے

میرا مکالمہ تو صرف اہلِ دل و نظر سے تھا
کیسے مرے حروف میں رنگ فضا کے آ گئے

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1-	کچھ اعتبار ساجد کے بارے میں (پروفیسر نظیر صدیقی)	11
2-	الحمد للہ	15
3-	میں کسے سنا رہا ہوں یہ غزل محبتوں کی	16
4-	اپنے بیٹے کے نام	18
5-	یہی تھا جانِ من بالکل ہمارا حال پہلے بھی	22
6-	ایسا نہیں کہ تیرے بعد اہل کرم نہیں ملے	24
7-	چلی ہے شہر میں اب کے ہوا ترکِ تعلق کی	26
8-	اپنی صفائی میں کوئی ہم نے بیاں نہیں دیا	28
9-	کہاں تھے تم؟	30
10-	نہ پوچھ ہم سے کہ اس گھر میں کیا ہمارا ہے؟	33
11-	جب آنکھیں بولنے لگتی ہیں	35
12-	ترے کنول، مرے گلاب سب دھوئیں میں کھو گئے	37
13-	ترکِ وفا تم کیوں کرتے ہو؟ اتنی کیا بیزاری ہے	39
14-	گریاں ہیں اکیلے در و دیوار ہمارے	41
15-	میں جانتا تھا ایسا بھی اک دور آئے گا	43
16-	کوئی تو تھا پسِ ہوا آخر شب کے دشت میں	45
17-	یہ جو قربتوں کا خمار ہے	47

کچھ اعتبار ساجد کے بارے میں

پروفیسر نظیر صدیقی

اعتبار ساجد دورِ حاضر کے اہل قلم میں بہت معروف وممتاز ہوں یا نہ ہوں وہ گمناموں اور بے نشانوں میں سے ہرگز نہیں ہیں۔ وہ پاکستان کے ادبی افق پر کوئی بیس پچیس سال پہلے ایک شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے۔ اگرچہ اس دوران میں وہ صرف شاعر نہیں رہے مضمون نگار، افسانہ نگار، کالم نگار اور سفرنامے کے مصنف کی حیثیت سے بھی سامنے آ چکے ہیں۔ ان تمام اصناف ادب میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی شناخت زیادہ تر شاعر ہی کی حیثیت سے ہے۔ اور وہ بھی غزل کے شاعر کی حیثیت سے۔ گو انہوں نے آزاد نظم کی صنف میں نظمیں خاصی تعداد میں لکھی ہیں۔

اس وقت تک اعتبار ساجد کی غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''وہی ایک زخم گلاب سا'' بھی شامل ہے۔

اچھی کتابیں وہ ہیں جو اہل نظر کی نظر سے گزریں اور وہ پوری غیر جانبداری کے ساتھ ان کے بارے میں موافقانہ رائے قائم کر سکیں یعنی بقول غالب اچھی کتابیں وہ ہیں جن پر قلم اٹھانے والے مصنف کے طرف دار نہ ہوں بلکہ سخن شناس اور سخن فہم ہوں۔ افسوس کی بات یہ ہے

کہ آج کتابوں کے اچھے یا برے ہونے کے معاملے میں غالب کے اس معیار یا اس کسوٹی کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کا ہر ادیب اور شاعر باون گز کا نظر آتا ہے حالانکہ شعروادب میں باون گز سے کم کا نظر آنا بھی کچھ کم فخر کی بات نہ تھی۔ لیکن چونکہ یہ دور پبلسٹی اور پروپیگنڈے کا دور ہے جس کے ذریعے معمولی سے معمولی لکھنے والے کو ایک عظیم ادیب یا شاعر بنا دیا جاتا ہے۔ اس لئے کوئی بھی ادیب یا شاعر عظیم کہلانے سے کم پر راضی نظر نہیں آتا۔

یہ بات بہت کم لکھنے والوں کی سمجھ میں آتی ہے کہ شعروادب میں صرف اچھے ہونے کے معیار تک پہنچنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ جبکہ کسی ادیب یا شاعر کا صرف اچھا ہونا کافی نہیں۔ اس کے لئے غیر معمولی اور غیرفانی ہونے کے معیار تک پہنچنا بھی ضروری ہے۔ یعنی اسے چاہئے کہ وہ غیر معمولی اور غیرفانی ہونے کی سطح کو بھی چھو سکے۔

اعتبار ساجد یقیناً ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔ ان کے ایک ہونہار یعنی ایک Promising Poet ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک اچھے شاعر اور ایک غیر معمولی شاعر کے درمیان جو فاصلہ ہے اسے وہ ابھی تک طے نہیں کر سکے ہیں۔ ممکن ہے ان کی شاعرانہ جدوجہد انہیں کسی وقت اس منزل تک پہنچا دے۔ اگر وہ زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے تو ممکن ہے دس پانچ شعر ایسے بھی کہہ جائیں یا دو چار نظمیں ایسی بھی لکھ جائیں جنہیں غیرفانی کہا جا سکے۔ ان باتوں کا تعلق ان کے مستقبل سے ہے اور مستقبل کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ادب یا شاعری صرف زور بازو کا کام نہیں اس امتیاز یا اعزاز کے حاصل کرنے میں تقدیر کو بھی دخل ہوتا ہے۔

سرِ دست ان کی شاعری کے معاملے میں صرف یہ دیکھنا کافی ہوگا کہ وہ کس قسم کی شاعری کر رہے ہیں۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کے مسائل کیا ہیں۔ ان کی شاعری زندگی کے کس علاقے سے رکھتی ہے۔ اس علاقے کی عکاسی اور ترجمانی میں وہ کہاں تک کامیاب ہیں' ان کی شاعرانہ حساسیت انہیں حیات و کائنات کے سمجھنے میں کہاں تک مدد دے رہی ہے۔ وہ صرف سامنے کی باتیں کہہ رہے ہیں یا فکر و وجدان کی گہرائیوں سے بھی کچھ تعلق رکھتے ہیں؟

اعتبار ساجد نے اپنی کتاب میں ''تیرا میر اکیلا روتا ہے'' کے عنوان سے ایک خیال انگیز اور تفکر طلب ابتدائیہ لکھا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت عام شاعروں سے زیادہ ہے۔ زندگی اور زمانے کے تغیرات پر ان کی نظر گہری ہے۔ وہ تغیرات کو صرف محسوس ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان تغیرات کے پیدا کردہ تلاطم سے دست و گریبان بھی ہیں۔ ان کا یہ ابتدائیہ غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اس ابتدائیے کی روشنی میں ان کی مجموعی شاعری جو انہوں نے اب تک کی ہے نہ صرف اس شاعری کا جواز سمجھ میں آسکے گا بلکہ اس کی معنویت پورے طور پر واضح ہو سکے گی۔

اس میں شک نہیں کہ اعتبار ساجد کی شاعری بے ناسازگار حالات کی شاعری ہے۔ اس بات پر انہیں خود بھی حیرت ہے کہ

میں کسے سنا رہا ہوں یہ غزل محبتوں کی
کہیں آگ سازشوں کی' کہیں آنچ نفرتوں کی

○

مرا کون سا ہے موسم مرے موسموں کے والی!
یہ بہار بے دلی کی' یہ خزاں مروتوں کی

○

میں قدیم بام و در میں انہیں جا کے ڈھونڈتا ہوں
وہ دیار نکہتوں کے' وہ فضائیں چاہتوں کی

شاعر کو نکہتوں کے دیار اور چاہتوں کی فضا ڈھونڈنے کے لئے قدیم بام و در یعنی ماضی کی طرف کیوں سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس کا ایک اہم سبب اعتبار ساجد یہ بتاتے ہیں کہ

کوئی پاس عزیز از جان کہاں
ہمسائے کا نام و نشان کہاں
اب میر اکیلا روتا ہے!

اعتبار ساجد کی جنگ اپنی ذات سے نہیں، اپنے زمانے سے ہے جو طرح طرح کی نفسا نفسی کا شکار ہے۔ ممکن ہے ان کی شاعری کا یہ مجموعہ غزلوں اور نظموں کا نہیں نوحوں اور مرثیوں کا مجموعہ معلوم ہو اور یہ نوحے اور یہ مرثیے دونوں مل کر دورِ حاضر کی ایک ایسی تاریخ مرتب کر رہے ہیں جسے پڑھتے وقت آپ بھول جائیں کہ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز نے کون سے ادبی انعامات جاری کئے، وہ انعامات کس طرح کے شاعروں کو ملے، ان انعامات کے دینے والوں کے پاس شاعری کی سچی پہچان تھی بھی یا نہیں۔ اب یقیناً ہم ایک ایسے دور میں آ گئے ہیں جس میں شعر کہنے والے اور لوگ ہیں، مشہور ہونے والے اور لوگ اور انعام پانے والے اور لوگ۔ یہ تینوں خوبیاں ایک شخص میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ اس المناک صورت حال پر تھوڑا سا رو لینا بھی بے جا نہ ہوگا!

الحمدللہ

شکر ہے خداوندا، انکسار قائم ہے
ہم نیاز مندوں کا، اعتبار قائم ہے

ایسے خشک موسم میں، تیری ہی عنایت سے
گلشن تمنا کا کاروبار قائم ہے

شکر ہے مرے مالک، بھیڑ میں کتابوں کی
اپنے چند لفظوں کا اعتبار قائم ہے

آج بھی مہکتی ہیں اپنے حرف کی کلیاں
آتے جاتے موسم میں یہ بہار قائم ہے

اہلِ دل کی محفل میں، اہلِ فن کی مجلس میں
اعتبار ساجد کا اعتبار قائم ہے

O

میں کسے سنا رہا ہوں یہ غزل محبتوں کی
کہیں آگ سازشوں کی، کہیں آنچ نفرتوں کی

کوئی باغ جل رہا ہے، یہ مگر مری دعا ہے
مرے پھول تک نہ پہنچے یہ ہوا تمازتوں کی

مرا کون سا ہے موسم مرے موسموں کے والی!
یہ بہار بے دلی کی، یہ خزاں مروتوں کی

میں قدیم بام و در میں انہیں جا کے ڈھونڈتا ہوں
وہ دیار نکہتوں کے، وہ فضائیں چاہتوں کی

کہیں چاند یا ستارے ہوئے ہم کلام مجھ سے
کہیں پھول سیڑھیوں کے، کہیں جھاڑیاں چھتوں کی

مرے کاغذوں میں شاید کہیں اب بھی سو رہی ہو
کوئی صبح گلستاں کی، کوئی شام پربتوں کی

کہیں دشت دل میں شاید مری راہ تک رہی ہو
وہ قطار جگنوؤں کی، وہ مہک ہری رتوں کی

یہ نہیں کہ دب گئی ہے کہیں گرد روز و شب میں
وہ خلش محبتوں کی، وہ کسک رفاقتوں کی

اپنے بیٹے کے نام

ہمارے بچپنے کی اک چونی میں
خدا جانے ہمارے کتنی ننھی خواہشیں تکمیل پاتی تھیں
پلاؤ اور تنجن سے
چنے کے سوختہ دانے بھلے معلوم ہوتے تھے
وہ سوندھی منگ پھلی اور اس چنے کی دال کی لذت
زباں اور ذہن کے اندر کہیں موجود ہے اب تک
یہ جنگل جن میں رستے‘ بستیاں اور کارخانے بن گئے ہیں
ہمیں یہ جگنوؤں اور تتلیوں کے شہر لگتے تھے
سجیلے نیل کنٹھوں‘ فاختاؤں اور ہرے طوطوں کے یہ خرمن

ہمارے خواب کے حیرت کدے اور جادو گھر تھے
ہوا تب اس قدر ٹھنڈی ملائم اور خوشبودار ہوتی تھی
کہ اس میں سانس لے کر روشنی دل میں اترتی تھی
گھروں‘ گلیوں میں ہمسایوں کے دکھ سکھ مشترک تھے سب
محبت ٹھوس سونے کی طرح سچی کھری تھی تب
تب اس بستی کا ہر فراخ در سونے کا در معلوم ہوتا تھا
جہاں یاقوت اور نیلم گلی کوچوں میں رلتے تھے
ہزاروں در تھے لیکن ایک گھر آنگن میں کھلتے تھے
محرم‘ عید میلاد النبی ﷺ‘ شبرات سب مل کر مناتے تھے
کسی ماتھے پہ مسلک کا کوئی بل تھا نہ سلوٹ تھی
سبھی اک دوسرے سے پیار کرتے تھے
عقائد اور زبانوں کے تعصب سے ابھی سینے نہ جکڑے تھے
ابھی چاہت کے یہ شفاف آئینے نہ چٹخے تھے
ہوا‘ بارود کی بو‘ خون کی خوشبو سے آلودہ نہ تھی اب تک
عبادت گاہ اور مکتب میں اتنے فاصلے بڑھنے نہ پائے تھے
مساجد کے کھلے در آہنی تالوں کے قابو میں نہ آئے تھے
ابھی بندوق برداروں کے نرغے میں
خدا کا نام لینے کی کڑی ساعت نہ آئی تھی
دواتوں میں ابھی تک علم و فن کی روشنائی تھی

ابھی تک تختیوں پر حرفِ حق کی رونمائی تھی
ہم اپنے خوبصورت عہد کے معصوم بچے تھے

O

حسن بیٹے! مگر یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا
تم ایسے عہد میں آئے ہو جب ٹوٹی دواتوں سے
سرِ فرشِ عبادت گہ لہو کے داغ روشن ہیں
بھڑکتے سرخ شعلوں سے مساجد اور دبستانوں کی دیواریں فروزاں ہیں
سرِ دیوار و در اب دہشتوں کے سائے لرزاں ہیں
وہ سرکنڈوں کے جنگل جل چکے جن سے
قلم لکھنے کی خاطر کاٹتے تھے ہم
جہالت کی خلیجیں پاٹتے تھے ہم
وہ جگنو بجھ گئے جو مٹھیوں میں جگمگاتے تھے
وہ رستے کھو گئے جو مکتب و مسجد کو آپس میں ملاتے تھے
ہرے طوطوں کے پر اب آشیانوں میں سلگتے ہیں
گھٹن اور حبس کے اس موسمِ جانکاہ کے باسی
مقفل کھڑکیاں اور بند روشن دان رکھتے ہیں
دیارِ خوف میں اب پھول کلیاں بیچنے والے
کلاشنکوف زیرِ سایۂ گلدان رکھتے ہیں

تم ایسے عہد میں آئے ہو جب تحفے میں دینے کو
ہم اپنی جیب میں صحرا نہ نخلستان رکھتے ہیں
مگر اچھے دنوں کے لوٹ آنے کا
ہم اپنے سوختہ دل میں بہت مدھم سا اک امکان رکھتے ہیں
اسی امکان پر ایمان رکھتے ہیں!

O

یہی تھا جانِ من، بالکل ہمارا حال پہلے بھی
یہی ہم سوچتے تھے آج سے کچھ سال پہلے بھی

ردائے خواب سے باہر نہیں نکلے ہیں ہم اب تک
ستاروں سے بھری اوڑھے ہوئے تھے شال پہلے بھی

اسی دامن سے آنسو پونچھتے تھے خلوتوں میں ہم
اسی مٹی میں رلتے تھے ہمارے لال پہلے بھی

در و دیوار ہی سنتے تھے سارے شہر کے دکھڑے
یہی تھا سامعینِ محترم کا کال پہلے بھی

یہی دامن تھا جس کی دھجیوں پر شعر لکھتے تھے
ہمارا شہر میں تھا میرؔ جیسا حال پہلے بھی

یہ عشقِ آرزو پہلے بھی گلیوں میں پھراتا تھا
گلے کا طوق تھا کم بخت یہ جنجال پہلے بھی

نئی اب کون سی حالات کی صورت نکل آئی
یہی ہم تھے، یہی تم تھے، یہی احوال پہلے بھی

O

ایسا نہیں کہ تیرے بعد اہل کرم نہیں ملے
لوگ تو کم نہیں ملے، لوگوں سے ہم نہیں ملے

ایک ترے فراق کے درد کی بات اور ہے
جن کو نہ سہہ سکے یہ دل، ایسے تو غم نہیں ملے

قصہء ترک رسم و رہ اس کے سوا ہے اور کیا
مل نہ سکیں طبیعتیں، اپنے قدم نہیں ملے

یہ تو ہوا کہ عشق میں نام بہت کما لیا
خود کو بہت گنوا لیا، دام و درم نہیں ملے

ایسا دیار ہجر نے ہم کو اسیر کر لیا
اور کسی کا ذکر کیا خود کو بھی ہم نہیں ملے

نام وروں کے شہر میں نام بہت ملے مگر
ہم سے گداز دل اسے اہل قلم نہیں ملے

O

چلی ہے شہر میں اب کے ہوا ترکِ تعلق کی
کہیں ہم سے نہ ہو جائے خطا ترکِ تعلق کی

بناوٹ گفتگو میں، گفتگو بھی اکھڑی اکھڑی سی
تعلق رسمی رسمی سا، ادا ترکِ تعلق کی

ہمیں وہ صبر کے اس موڑ تک لانے کا خواہاں ہے
کہ تنگ آ جائیں ہم، مانگیں دعا ترکِ تعلق کی

بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے وہ ترک مراسم کے
اسے ویسے بھی عادت ہے ذرا ترکِ تعلق کی

یہ بندھن ہم نے باندھا تھا سلامت ہم کو رکھنا تھا
بہت کوشش تو اس نے کی سدا ترکِ تعلق کی

وہ ملتا بھی محبت سے ہے لیکن عادتاً ساجدؔ
کیے جاتا ہے باتیں جا بجا ترکِ تعلق کی

O

اپنی صفائی میں کوئی ہم نے بیان نہیں دیا
جل جل کے راکھ ہو گئے پھر بھی دھواں نہیں دیا

کتنی تھی سنگ دل ہوا، جس نے ہم اہلِ شوق کے
سارے دیے بجھا دیئے اذنِ فغاں نہیں دیا

ایسا نہیں ملا کوئی جس سے بیان حال ہو
ورنہ تو اشتہار دل ہم نے کہاں نہیں دیا

پنجرے کی جالیوں سے کچھ پھول دکھائی دے سکیں
اب کے بہار نے ہمیں ایسا سماں نہیں دیا

کیسے ہیں بدنصیب لوگ، جن کو خدا نے دہر میں
نطق تو کر دیا عطا، حسنِ بیاں نہیں دیا

تخت پہ بیٹھ کر بھی وہ رب سے گلہ گذار ہیں
رنج یہ ہے کہ کیوں انہیں تختِ رواں نہیں دیا

کہاں تھے تم؟

سو اب آئے ہو تم کھنکھار کے عرض ہنر کرنے؟
سخن کو اور بے توقیر اور نا معتبر کرنے
جب اہل شہر کی آواز پابند سلاسل تھی
قصیدے لکھ رہے جب انائیں بیچنے والے
تجارت کر رہے تھے جب صدائیں بیچنے والے
تو تم اس بھیڑ سے ہٹ کر
ہجوم شہر سے کٹ کر
الگ پہچان لے کر سامنے اہل سخن کے کیوں نہیں آئے؟
بتایا کیوں نہیں تم نے حق و باطل کی اس جنگاہ میں

تم کس کی جانب ہو؟
کہاں ہو تم؟
کہاں تھے تم؟
جب ایسی کرسیوں کا مول بھاؤ ہو رہا تھا
جنہیں منصب نہیں تقدیس سے پہچانا جاتا تھا
ہمیشہ معتبر گردانا جاتا تھا
تو اس نیلام عام منصفی کے زرد موسم میں
کہاں تھے تم؟
جب اپنے دشمنوں کی لاش پر رقصاں تھے دشمن
وفور انبساط فتح میں لاشوں پہ بھنگڑے ڈال کر نغمہ سرا تھے
پس دیوار و در جب وارثوں کی سسکیاں بھی گھٹ گئیں تھیں
جب اللہ کی زمیں پر اس کے بندوں کا لہو
پانی کی صورت بہہ رہا تھا
جب اک لاشے پہ کوئی ''ابا'' ''ابا'' کہہ رہا تھا
تم کہاں تھے؟
جب اک اجلی عبادت گاہ کے فرش مقدس پر
تلاوت کرنے والے بے گناہ معصوم بچوں کے لہو میں
گولیوں کے خول اچھلتے، آگ اگلتے پھر رہے تھے
عبادت کرنے والے آخری سجدے کے عالم میں زمیں پر گر رہے تھے

تم کہاں تھے؟

O

سنہرے تیل کے چشموں کے مالک
ہماری بستیوں میں جب برائے عیش و عشرت خیمہ زن تھے
جب ان کے سامنے صف بستہ خدمت گار کچھ اہل وطن تھے
شکاری جب حواس و ہوش اپنے کھو رہے تھے
ہماری بیٹیوں کے آنچلوں کے نقد سودے ہو رہے تھے
گھروں میں بوڑھے مفلس باپ اپنے منہ چھپائے رو رہے تھے
برہنہ جسم جب غرقاب دریا ہو رہے تھے
زباں بندی کی خاطر بے نوا لوگوں کو دھمکایا گیا تھا
جب ان کے منہ میں زر کا زہر ٹپکایا گیا تھا
تم کہاں تھے؟
اگر تم تھے تو کس صف میں کھڑے اس ظلم پر نوحہ کناں تھے؟
تمہارا احتجاج اور اس کے اندر کی توانائی کہاں تھی؟
تمہاری حق پرستی اور سچائی کہاں تھی؟
کہاں تھے تم؟
کہاں تھے؟

O

O

نہ پوچھ ہم سے کہ اس گھر میں کیا ہمارا ہے
اسی میں خوش ہیں کہ حسنِ فضا ہمارا ہے

الگ مزاج ہے اپنا تمام لوگوں سے
تمام قصّوں میں قصّہ جدا ہمارا ہے

کسی بھی خشت پہ ہر چند حق نہیں رکھتے
مگر یہ شہر بفضلِ خدا ہمارا ہے

ہماری شہرتوں' رسوائیوں کے کیا کہنے
کہ سنگ راہ بھی نام آشنا ہمارا ہے

جلاتے پھرتے ہیں ہم کاغذی گھروں میں چراغ
رہے یہ ڈھنگ' تو حافظ خدا ہمارا ہے

دلوں کے قریۂ بیگانگی میں رہتے ہیں
سو دوستو یہی تازہ پتہ ہمارا ہے

ہمیں یہ آخری خوش فہمیاں نہ لے ڈوبیں
کہ سیل آب شریک نوا ہمارا ہے

بہت ہے شور مگر اطمینان بھی کہ یہاں
کوئی تو ہے جو سخن آشنا ہمارا ہے

جب آنکھیں بولنے لگتی ہیں

کیا وہ ساعت آپہنچی ہے؟
جب سارے پل بہہ جاتے ہیں
لنگر ہلتے رہ جاتے ہیں
کوئی چپو ہاتھ نہیں آتا
کوئی کشتی ساتھ نہیں دیتی
کیا وہ ساعت آپہنچی ہے؟

☆

جب لفظوں کی شریانوں میں
تاثیر نوا سو جاتی ہے

جب جھوٹ کے کوڑے دانوں میں
ہر سچائی کھو جاتی ہے
جب ہونٹ لرزنے لگتے ہیں
تب آنکھیں بولنے لگتی ہیں

☆

جب آنکھیں بولنے لگتی ہیں
تب روز قیامت ہوتا ہے
کیا وہ ساعت آ پہنچی ہے؟

O

ترے کنول، مرے گلاب سب دھوئیں میں کھو گئے
محبتوں کے تھے جو باب سب دھوئیں میں کھو گئے

ہوائے ہجر نے بجھا دیئے ترے چراغ سب
مرے نجوم و ماہتاب سب دھوئیں میں کھو گئے

مری دعائیں، التجائیں سب ہوا میں اڑ گئیں
ترے حروف باریاب سب دھوئیں میں کھو گئے

تھوں سے دل کی شعلہء فراق اس طرح اٹھا
کہ اس کے بعد اپنے خواب سب دھوئیں میں کھو گئے

جلا رہے تھے کاغذی گھروں میں موم بتیاں
ہوا نے کھائے پیچ و تاب سب دھوئیں میں کھو گئے

ہوئیں جو نذرِ آتشِ جنوں تمام راحتیں
مرا قلم تری کتاب سب دھوئیں میں کھو گئے

وہ گھر تو خواب گاہ کے چراغ نے جلا دیا
کہاں کی نیند، کیسے خواب سب دھوئیں میں کھو گئے

O

ترکِ وفا تم کیوں کرتے ہو؟ اتنی کیا بیزاری ہے
ہم نے کوئی شکایت کی ہے؟ بے شک جان ہماری ہے

تم نے خود کو بانٹ دیا ہے کیسے اتنے خانوں میں
سچوں سے بھی دعا سلام ہے، جھوٹوں سے بھی یاری ہے

کیسا ہجر قیامت کا ہے لہو میں شعلے ناچتے ہیں
آنکھیں بند نہیں ہو پاتیں، نیند حواس پہ طاری ہے

تم نے حاصل کر لی ہو گی شاید اپنی منزلِ شوق
ہم تو سرابوں کے راہی ہیں اپنا سفر تو جاری ہے

پتھر دل بے حس لوگوں کو یہ نکتہ کیسے سمجھائیں
عشق میں کیا بے انت نشہ ہے یہ کیسی سرشاری ہے

تم نے کب دیکھی ہے تنہائی اور سناٹے کی آگ
ان شعلوں میں اس دوزخ میں ہم نے عمر گذاری ہے

O

گریاں ہیں اکیلے در و دیوار ہمارے
یہ لاش ہماری' یہ عزادار ہمارے

ہم اپنی طرف لوٹ کے آنے نہیں پائے
حائل تھے کئی راہ میں منجدھار ہمارے

ہر عہد میں دیکھا کہ عدالت تو لگی ہے
آئے نہ کٹہرے میں گنہگار ہمارے

پت جھڑ ہو کہ گلشن میں بہاروں کا سماں ہو
ہر حال میں خوش رہتے ہیں کچھ یار ہمارے

یہ لوگ بدل لیتے ہیں پھر بعد میں کاندھے
کچھ دیر بہت رہتے ہیں غم خوار ہمارے

مٹی کے کھلونوں کی طرح ملتے ہیں ساجدؔ
ہیں خیر سے ارزاں بت پندار ہمارے

O

میں جانتا تھا ایسا بھی اک دور آئے گا
دیوان بھی مرا، تو ہر اک سے چھپائے گا

پوچھے گا جب کوئی ترا دکھ، ازراہِ خلوص
تو اس کو دوسروں کے فسانے سنائے گا

جو بات بھولنے کی ہے یاد آئے گی تجھے
رکھنا ہے جس کو یاد اسے بھول جائے گا

دل سوختہ ملے گا تجھے جب کوئی، کہیں
شدت سے ایک شخص تجھے یاد آئے گا

چھوڑا ہے اس کا شہر فقط اس خیال سے
جب ہم نہ ہوں گے اور وہ کس کو ستائے گا

اس نے بھی کر لیا ہے یہ وعدہ کہ عمر بھر
کچھ بھی ہو، اب وہ دل نہ کسی کا دکھائے گا

O

کوئی تو تھا پسِ ہوا، آخرِ شب کے دشت میں
ہم سے جو ہم کلام تھا آخر شب کے دشت میں

جیسے کسی کی یاد نے سینے پہ ہاتھ رکھ دیا
جیسے کوئی دیا جلا آخر شب کے دشت میں

ایک ہجوم دلبراں، ایک جلوس رفتگاں
بچھڑا تو ہم سے آ ملا آخر شب کے دشت میں

اک جو ملال ہجر تھا صبح طلب سے شام تک
ہم نے کہیں گنوا دیا آخر شب کے دشت میں

ایسا لگا کہ اوس میں بھیگے ہوئے درخت سے
موج ہوا نے کچھ کہا آخر شب کے دشت میں

زینہ دل پہ چاپ سی جانے تھی کس خیال کی
درد تلک کوئی نہ تھا آخر شب کے دشت میں

یہ جو قربتوں کا خمار ہے

مرے اجنبی، مرے آشنا!
تو مصر کہ آئینہ خانے میں
ترے خال وخد کے سوا مجھے
کہیں اور کچھ نہ دکھائی دے
یہ عذابِ طوق ورسن مرا
کسی قصرِ خواب وخیال تک
مرے ذہن کو نہ رسائی دے
مجھے راستہ نہ سجھائی دے
تو یہ چھت جو اپنے سروں پہ ہے

یہ جو بام و در کے حصار ہیں
یہ جو رت جگوں کی بہار ہے
یہ جو قربتوں کا خمار ہے
تو اسی پہ کیا شبِ عمر کی سبھی راحتوں کا مدار ہے؟
مرے اجنبی، مرے آشنا!
کہ دھواں دھواں سی جو ہے فضا
یہ تھمی تھمی سی جو ہے ہوا
یہ جو شور ہے دلِ زار کا
کبھی اس پہ غور کیا ہے کیا؟
مرے اجنبی مرے آشنا
کبھی کاش تجھ سے میں کہہ سکوں
کہ یہ ساعتیں ہیں کٹھن بہت
مرے زخمِ جاں کے طبیب آ
مرے تن بدن سے بھی ربط رکھ
مری روح کے بھی قریب آ
مرے اجنبی مرے آشنا......!

O

یہ دشت، وہ رہِ صحرا بھی مجھ کو دیکھنے دو
اب امتحاں کا نتیجہ بھی مجھ کو دیکھنے دو

اس آئینے پہ تمہارا ہی اختیار سہی
کبھی کبھی مرا چہرہ بھی مجھ کو دیکھنے دو

تعینِ رہ و منزل مجھی کو کرنا ہے
سو اپنی آنکھ سے رستہ بھی مجھ کو دیکھنے دو

مرے ہی نام سے روشن ہیں بام و در جس کے
اب اس مکاں کا نقشہ بھی مجھ کو دیکھنے دو

شریکِ رنجِ سفر تم ضرور ہو لیکن
کوئی تو خواب اکیلا بھی مجھ کو دیکھنے دو

O

سکون درد کو، غم کو دوا بناتی ہے
یہ شاعری ہے، عجب معجزے دکھاتی ہے

کسی کے پاؤں کی آہٹ، کسی کی سرگوشی
ہوائے ہجر، صدائیں بہت سناتی ہے

بدلنے لگتی ہے ہر گام پر سراب کی شکل
ہوائے دشت، بہت صبر آزماتی ہے

اسی سے شکوہ بھی رہتا ہے تلخ گوئی کا
کہ جس سے اپنی طبیعت قرار پاتی ہے

تمہاری مجھ سے ملاقات بھی اچانک تھی
تمہارا مل کے بچھڑنا بھی حادثاتی ہے

کہیں یہ کوئی نئی سازشِ ہوا تو نہیں
کہ کچھ چراغ بچاتی ہے، کچھ بجھاتی ہے

O

کیا دوستوں کا رنج کہ بہتر نہیں ملے
دشمن بھی ہم کو قد کے برابر نہیں ملے

اس بحرِ آرزو میں جو کرتے ہمیں تلاش
اب تک تو ہم کو ایسے شناور نہیں ملے

بس ایسا کچھ ہوا کہ سمجھ میں نہ آ سکا
دل مل گئے، ہمارے مقدر نہیں ملے

ملتے ہیں لوگ لمبی جدائی کے بعد بھی
تم ایسے گم ہوئے کہ پلٹ کر نہیں ملے

لوگوں نے گفتگو میں کریدا بہت ہمیں
ہم خود سے ہمکلام تھے اکثر نہیں ملے

اب کے عجب بہار کا موسم ہمیں ملا
صندل سے جسم، پھول سے پیکر نہیں ملے

آخری گفتگو

یہ تصویریں ہیں
خط ہیں
اور کچھ پرزے ہیں
جن پر تم مجھے پیغام لکھتی تھیں
انہیں محفوظ کرلو
ہاں مگر افسوس
ٹیلی فون پر جو گفتگو

تم مجھ سے کرتی تھیں
انہیں میں تم کو واپس کر نہیں سکتا
جو میری دسترس میں تھا
تمہارے سامنے ہے سب
جو باقی ہے
صدا ہے اب!

O

بھڑک سکتی ہے ظالم آگ’ پانی میں نہیں رہنا
تم اپنی شاعرانہ خوش بیانی میں نہیں رہنا

نظر رکھنا کہ اس کے اور کیا کیا اب ارادے ہیں
فقط تم یار جانی’ یار جانی میں نہیں رہنا

وہ زندہ آدمی کو بت بنا سکتا ہے’ سمجھے تم؟
اسیر اس شوخ کی جادو بیانی میں نہیں رہنا

جہاں تک ساتھ دیں سانسیں وہیں تک لطفِ نغمہ ہے
تر و تازہ یہ لہجہ دورِ ثانی میں نہیں رہنا

ہمارے بعض شعرائے مکرم کا مقولہ ہے
ضعیفی میں جواں رہنا’ جوانی میں نہیں رہنا

تم اپنا خود کوئی کردار ساجدؔ منتخب کر لو
گداگر بن کے شاہوں کی کہانی میں نہیں رہنا

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

دشت عمر کی دھوپ میں تشنہ
میلوں پیدل چلتے چلتے
دھوپ اور لُو میں جلتے جلتے
زخمی تلوے ملتے ملتے
جب درماندہ حال مسافر
کسی دوکان بیم ور جا سے
مانگ تانگ کر برف کے قتلے
پھلیے ہوئے دامن میں رکھ کے
اپنے گھر کا رخ کرتا ہے

بڑھ جاتی ہے دھوپ کی حدت
گرد و غبار میں کھو جاتا ہے
رستہ گھر لے جانے والا
دامن خالی ہوتا ہے
برف کی قلمیں بہہ جاتی ہیں
آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

○

خلق خدا کے خوف سے اکثر
جو باتیں ہم کہہ نہیں سکتے
پتھر چونے اور کاغذ کی
یہ دیواریں کہہ جاتی ہیں
آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں!

O

تو نے تو اے رفیق جاں، اور ہی گل کھلا دیئے
بخیہ گری کے شوق میں زخم نئے لگا دیئے

دست ہوا نے ریت پر پہلے بنائے راستے
پھر مرے گھر کے راستے، گھر سے ترے ملا دیئے

کتنی تھی اجنبی فضا، پہلے پہل فراق میں
درد کے اشتراک نے دوست کئی بنا دیئے

آمد یار کی خبر، سن کے ہم اہل شوق نے
پلکوں سے گرد صاف کی رستے میں دل بچھا دیئے

پوچھا تھا کیا پسند ہے تم کو مری بیاض میں
اس نے جدائیوں کے شعر چن کے مجھے سنا دیئے

آخری سنگ میل تک سانس اکھڑی چلی مگر
پیش خیال تھا کوئی، ہم نے قدم بڑھا دیئے

ایک ستم ظریف نے صبح طرب کے نام پر
اپنا دیا بچا لیا سب کے دیئے بجھا دیئے

کتنا سخن شناس تھا طعنہ دیا تو یوں دیا
آپ کے فن کے رت جگے ہجر نے جگمگا دیئے

ہمیں آواز دے دینا

اگر دکھ زندگانی کے
تمہیں آزار پہنچائیں
کوئی جلتی ہوئی ساعت، کوئی بجھتا ہوا لمحہ
تمہارے دل پہ دستک دے
تو ہم کو یاد کر لینا
ہمیں آواز دے دینا
ابھی زندہ ہیں ہم اس زندگی کی بیکرانی میں
ابھی تک دے رہے ہیں امتحاں

اس کارگاہِ امتحانی میں
ابھی تک مبتلا ہمیں، ہم اسی خواب جوانی میں
تم اپنا کوئی دکھ ہم سے نہیں تو کس سے بانٹو گے؟
کسے آواز دو گے تم؟

O

وہاں سے لوٹتا ہے جست جس گوشے میں کرتے ہیں
ہمیں معلوم ہے پرواز ہم پنجرے میں کرتے ہیں

کوئی صدیاں نہیں لگتیں ہمارے دن بدلنے میں
ہم اپنا فیصلہ بس ایک ہی لمحے میں کرتے ہیں

در و دیوار زنداں سے مخاطب ہو رہے ہیں ہم
وہی کچھ کر رہے ہیں لوگ جو ایسے میں کرتے ہیں

سنی تھی ہم نے بھی شیرینیٔ گفتار کی شہرت
مگر وہ گفتگو کچھ اور ہی لہجے میں کرتے ہیں

بھٹکتے پھر رہے ہیں آج تک اس جرم عصیاں پر
مذمت رہزن و رہبر کی ہم رستے میں کرتے ہیں

یہ صحرا شام تک ساری گلی میں پھیل جاتا ہے
ہم اپنی صبح کا آغاز جس کمرے میں کرتے ہیں

کسی دن ان فضاؤں میں چہکتے دیکھنا ہم کو
ابھی اس شوق کی تکمیل ہم پنجرے میں کرتے ہیں

O

فقط اپنی ضرورت کے لئے غم خوار تھے میرے
برہنہ سر جو زیرِ سایۂ دیوار تھے میرے

کہیں منصف، کہیں مجرم، کہیں بے خانماں تھا میں
ہر اک منظر میں یکسر مختلف کردار تھے میرے

کھلی جب آنکھ میری، اک عجب ہو کا بیاباں تھا
نہ تھے جاروب کش میرے نہ پہرے دار تھے میرے

پلک جھپکی تو ملبے کی طرح بکھرا پڑا تھا میں
کدالیں تھیں انہیں ہاتھوں میں جو معمار تھے میرے

وہ میرے دوست کب تھے جن سے دل کی بات میں کرتا
فقط دفتر کی میزوں پر شریک کار تھے میرے

وہ اپنے جاہ و منصب کی گواہی لینے آئے ہیں
ابھی کل تک جو ساجدؔ مورچھل بردار تھے میرے

O

کیا وہاں کام مری طاقتِ گفتار کا تھا
میرا تو رول ہی خاموش اداکار کا تھا

دھوپ میں کیسا غنیمت تھا' ہمیں جانتے ہیں
اتنا مدھم سا جو سایہ تری دیوار کا تھا

قدر و قیمت مری تحریر کی کیسے ہوتی
میں مصاحب تھا نہ منشی کسی دربار کا تھا

میرے بچے یونہی بے تاب ہوئے پھرتے تھے
صحن میں عکس فقط شاخِ ثمر دار کا تھا

ماں! اچانک ترے ہاتھوں نے مجھے تھام لیا
یاد آتا ہے کہ منظر کسی منجدھار کا تھا

بات کرتا تھا وہ ہم رتبہ رفیقوں کی طرح
جس کی پاپوش تلے پر مری دستار کا تھا

کسی کم ظرف کے ہاتھوں نہیں کھائی ہے شکست
خوش میں اس پر ہوں کہ دشمن مرے معیار کا تھا

O

حروف آگہی تھے بے کس و لاچار کیا کرتے
کلاشنکوف کے آگے مرے اشعار کیا کرتے

جہاں گولی سے حرف جسم پر اعراب لگتے ہیں
وہاں منطق، دلیلیں، فلسفے، افکار کیا کرتے

جنہیں اپنی پرستش سے کبھی فرصت نہیں ملتی
ہم ان کے روبرو اپنا بت پندار کیا کرتے

نصیحت کرنے والوں کو بھی خوش رکھنا ضروری تھا
جو میں اپنی سی کرتا یہ ہدایت کار کیا کرتے

دلیلیں دے رہے تھے لوگ اپنی قامت فن کی
ہمیں نے سادھ لی چپ، حجتیں بیکار کیا کرتے

مکینوں کو مکینوں کی طرح پایا نہیں ہم نے
سو اس بستی میں تحسین در و دیوار کیا کرتے

ہماری کشتیء امید کا انجام ظاہر تھا
مخالف تھی ہوا، ٹوٹے ہوئے پتوار کیا کرتے

اگر ہوتے بہادر شاہ کے عہد سخن میں ہم
یہی دو حرف لکھتے اور کاروبار کیا کرتے

O

حسنِ بیان قصر کا ایسا بھی اہتمام کیا
گھر تو مکیں کے دم سے ہے ذکر فراز بام کیا

ایک ہمی پہ کس لئے تیری نگاہ التفات
عمر رواں! تجھے کوئی اور نہیں ہے کام کیا

کوئی تو آسرا رہے، خواب وصال ہی سہی
گریۂ ہجر کب تلک، روئیں اسے مدام کیا

چاہئے اک نگاہ شوق، ورنہ بساط دہر پہ
میری خلش کے نرخ کیا تیری تڑپ کے دام کیا

مجھ سے حساب روز وشب، اے میری زندگی نہ مانگ
سوختہ دل کی صبح کیا، قریہ نشیں کی شام کیا

اہل نظر کی دین ہے اپنا یہ اعتبار فن
ورنہ ہمارے حرف کیا، ورنہ ہمارا نام کیا

ترا ہجر ہی پیارا ہے

وصل کے موسم کا کیا کہنا
لمحہ بھر کے سکھ کے بدلے
پھر وہی حال ہمارا ہے
آنکھوں میں ساون کی شامیں
چہرہ درد کا مارا ہے
پلکوں کی ڈھلوان پہ لرزاں
اشک کا دھندلا تارا ہے
مت کر ہم سے وصل کے وعدے
کب اس کیف کا یارا ہے

اور بڑھا دے ہجر کی تلخی
یہی تو ایک سہارا ہے
تجھ سے دور ہی اچھے ہیں ہم
جو بھی حال ہمارا ہے
کیا لینا ہے تجھ سے مل کر
تیرا ہجر ہی پیارا ہے!

O

صاف جب تک نہ ترے ذہن کے جالے ہوں گے
کیسے تحریر محبت کے مقالے ہوں گے

کیا ہمیں نیند بھی آئے گی تری خواہش پر؟
کیا فقط خواب ہی ہم دیکھنے والے ہوں گے

اس طرح دشتِ محبت سے گذر جاؤں گا
جسم زخمی نہ مرے پاؤں میں چھالے ہوں گے

کیسے ہو گی مری چاہت کی امانت محفوظ
اس نے اب تک مرے خط کیسے سنبھالے ہوں گے

گھر کے اندر بھی کوئی مجھ پہ توجہ دیتا
گھر کے باہر تو کئی چاہنے والے ہوں گے

جب مسیحائی کی تاریخ لکھی جائے گی
اس میں شامل مرے زخموں کے حوالے ہوں گے

O

تری طلب نے ہمیں کس قدر خراب کیا
کہ ہم نے آپ ہی اپنا سفر خراب کیا

جو کم نظر ہیں ہمیں ان پہ اعتراض نہیں
ہمیں تو آپ نے اہل نظر خراب کیا

کوئی فراق سی راحت، کوئی وصال سا رنج
اسی جنوں نے ہمیں دربدر خراب کیا

شریک رنج سفر ہو کے کیا ملا تجھ کو
بلا جواز ہمارا سفر خراب کیا

جو دل میں آئی اسے بام و در پہ لکھ ڈالا
تمہاری طبع رواں نے یہ گھر خراب کیا

حسین گھر تھے سمندر کے سامنے لیکن
ہوائے نم نے رخ بام و در خراب کیا

ہمیں نکال کے بزم غزل سے کیا نکلا
عدوئے شعر نے باب ہنر خراب کیا

O

ہیں یوں تو بہت آپ کی قربت سے بھی محروم
ہم لوگ کہ ہیں، اپنی رفاقت سے بھی محروم

ہر لمحہ ہیں اک ہجر مسلسل کی فضا میں
پھر بھی ہیں، غمِ ہجر کی راحت سے بھی محروم

صحرا کی طرح ہے کہ شجر ہیں نہ کہیں پھول
جو ذہن ہے شعروں کی لطافت سے بھی محروم

اف، اتنی تگ و تاز کے باوصف بھی کچھ لوگ
شہرت سے بھی محروم، ہیں عزت سے بھی محروم

مانگی ہوئی بیساکھیاں کچھ کام نہ آئیں
اور ہو گئے اصل قد و قامت سے بھی محروم

حیرت ہے کسی نے بھی نوازا نہیں ان کو؟
جاہل بھی ہیں، دستارِ فضیلت سے بھی محروم

O

صاف تو کہہ رہے ہیں ہم اپنی مراد گھر سے ہے
تیرا معاملہ مگر شوکتِ بام و در سے ہے

جانے بہانہ جُو رفیق کون سا گل کھلائے کب
راہ میں مشکلیں بھی ہیں، خوف بھی ہم سفر سے ہے

بچھڑے تو کیا بتائیں گے شہرِ ادا شناس کو
سو، تجھ سے ربط وضبط بھی خلقِ خدا کے ڈر سے ہے

پھر بھی بھٹک رہا ہے تو، شہر ہوا کے اجنبی!
اتنی جو روشنی یہاں میرے چراغِ در سے ہے

وہ بھی گلہ گزار ہیں میرے سخن کے شور سے
جن کا ثبات آگہی میرے غمِ ہنر سے ہے

ایک دُعا

(عروس البلاد کراچی کے پس منظر میں)

رحم کر اے خدا،
اے خدا رحم کر
جل چکے اپنے گھر
اپنے ننھے فرشتوں کے پر
بام و در
خواب دیکھے تھے جن انکھڑیوں نے کبھی
صحنِ گلزار کے
ان میں اب گرد ہے اور دھوئیں میں کھنڈر

رحم کر اے خدا'

اے خدا رحم کر

آس کا کوئی جھونکا' خوشی کی خبر!

جو شگوفوں کے چہروں سے بچھڑی ہوئی

مسکراہٹ کا در کھول دے

اور بارود کے اس دھوئیں میں

سجل خوشبوئیں گھول دے

میرے بچوں کی سہمی ہوئی آنکھ کو

صبح امید کی روشنی بخش دے

شہر کے بے اماں مضطرب باسیوں کے

سلگتے ہوئے ذہن کو تازگی بخش دے

چھین لے مجھ سے میری توانائیاں

اس کے بدلے میں اجڑے ہوئے شہر کو

زندگی بخش دے!

O

بیٹھے بٹھائے لوگ مصیبت میں پڑ گئے

بنیاد کیا ہلی کہ گڑھے چھت میں پڑ گئے

کیسا علاج زخم تمنا' کہاں کا چین

یہ آپ لوگ کون سی زحمت میں پڑ گئے

ہم مشکلوں سے بھاگنے والے بہانہ جو

عقدہ کشائیوں کی اذیت میں پڑ گئے

شوقِ سفر میں کون ٹھہرتا کہ دیکھتا
وہ آبلے جو پائے رفاقت میں پڑ گئے

اس نے وفا کے نام پہ کی ایسی گفتگو
ہم اہل شوق ورطۂ حیرت میں پڑ گئے

پھر آبروئے جبہ و دستار بھی گئی
جب پاؤں خارزارِ سیاست میں پڑ گئے

اس نے ثبوت زخم جگر کیا طلب کیا
سب عافیت پسند مصیبت میں پڑ گئے

O

ہر روز سوچتا ہوں مقدر بناؤں گا
ترکِ سفر کروں گا کہیں گھر بناؤں گا

اس کہکشاں سے مانگ سجاؤں گا میں تری
اس ماہتاب کو ترا جھومر بناؤں گا

سب موسموں کے عکس دکھاؤں گا ایک ساتھ
کاغذ پہ جب کبھی ترا پیکر بناؤں گا

پیش نظر جو ہے اسے کیا نقش و رنگ دوں
جو سامنے نہیں ہے وہ منظر بناؤں گا

یہ ان کی کشتیوں کی گزرگاہ آب ہے
اپنے لئے الگ میں سمندر بناؤں گا

آئے گی دشت سے مری آواز بازگشت
ان گنگ وادیوں کو سخنور بناؤں گا

گر چشم و پا نے چھوڑ دیا اس سفر میں ساتھ
بیٹے کو اپنی راہ کا رہبر بناؤں گا

O

یہ رات بے نوید ہے مزید عرض کیا کریں
سحر کی کم امید ہے مزید عرض کیا کریں

ان آندھیوں میں ہم اسیر بام و در ہوئے، جہاں
گھٹن بہت شدید ہے مزید عرض کیا کریں

شکستہ ٹہنیوں پہ بھی کھلیں گے پھول خیر سے
شنید ہی شنید ہے مزید عرض کیا کریں

وہ فصلِ گل جب آئے گی تو دیکھئے گا آپ بھی
ابھی تو شوقِ دید ہے مزید عرض کیا کریں

وہی حسینؑ بے وطن ہے تشنہ لب فرات پر
وہی صفِ یزید ہے مزید عرض کیا کریں

قفس کی جالیوں سے دیکھتے ہیں رونقِ چمن
یہی ہماری عید ہے مزید عرض کیا کریں

دلیلِ حق جو لا رہے ہیں اپنے صاحبانِ فن
سوءِ عقل سے بعید ہے مزید عرض کیا کریں

ٹھہر کے رت جگوں کی داستان کیا کریں بیاں
ابھی سفر مزید ہے مزید عرض کیا کریں

O

اندھیری شب میں لئے روشنی نکل آیا
ادھر یہ کون دوانہ سخی نکل آیا

یہ کیا کہ تجھ سے رہ و رسم کے حوالے پر
تمام شہر مرا اجنبی نکل آیا

جو میں نے زور دیا اپنی بے گناہی پر
تو سنگِ رہ بھی ترا مدعی نکل آیا

مجھے تو راہ نہ دیتا تمام عمر کوئی
قطار چھوڑ کے میں آپ ہی نکل آیا

کئی چراغ بکف بے دیار لوگوں سے
ہمارا سلسلۂ دوستی نکل آیا

پہن کے میرے خدوخال، ماہ و سال تمام
کل آئینے سے نیا آدمی نکل آیا

آئینے کے سامنے

پروردگار نے یہ کیا مجھ پہ لطفِ خاص
میرے لئے دکھوں کو بھی تسخیر کر دیا
شیشہ مثال تھے مرے اوراقِ شاعری
میں نے بھی اپنے آپ کو تحریر کر دیا

اعزاز

سلام اس ماں کو
جس کے آخری بیٹے کو دشمن نے
تہِ تیغِ ستم کر کے
دیا گُل کر دیا ہے ایک کنبے کا
مگر ماں پھر بھی کہتی ہے:

خداوندا'
مجھے کاش اور بھی بیٹے دیئے ہوتے
انہیں بھی یہ مقام و عزت و توقیر مل جاتی!

O

میں تو اپنے خوابوں کا دربار لگائے بیٹھا تھا
دشمن میرے پہلو سے تلوار لگائے بیٹھا تھا

اسی نے دروازہ کھولا تھا مرے عدو کی دستک پر
میں ڈیوڑھی میں جس کو پہریدار لگائے بیٹھا تھا

اب دنیا مظلوم سمجھ کر کیا اس کی توصیف کرے
کل تک جو کلغی والی دستار لگائے بیٹھا تھا

ڈال ڈال پر اڑنے والے پنچھی کس کے میت ہوئے
میں ناحق اپنے دل کو آزار لگائے بیٹھا تھا

میرے کونسے خواب اونچے تھے میں تو کونے کھدرے میں
چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا انبار لگائے بیٹھا تھا

کون مسیحا پرسش حال کی خاطر میرے پاس آیا
میں جو اپنے زخموں کا بازار لگائے بیٹھا تھا

O

کیوں ہے ہر شعر لہو رنگ تجھے کیا معلوم
میرے جذبات کی فرہنگ تجھے کیا معلوم

پیاس کیسی ہے، لہو دل کا طلب کرتی ہے؟
زرد کیونکر ہے مرا رنگ تجھے کیا معلوم

لوگ اک سادہ سی دستار کے دشمن کیوں؟
مجھ پہ کیوں اٹھتا ہے ہر سنگ تجھے کیا معلوم

اک طرف عشق، ادھر بھوک کے بے انت عذاب
دو محاذوں پہ ہے یہ جنگ تجھے کیا معلوم

کس لئے لوگ اڑاتے تھے مرے فن کا مذاق
کس لئے لوگ ہیں اب دنگ تجھے کیا معلوم

کتنے دکھ سہتا ہوں تب ایک غزل کہتا ہوں
میرے دن، رات کا آہنگ تجھے کیا معلوم

O

نہیں کہ منزلِ قلب و نظر ہے اور کوئی
وہی سفر ہے مگر رہگذر ہے اور کوئی

کسی کے زخم ہیں کوئی بھگت رہا ہے عذاب
کسی کا کاسہ ہے دریوزہ گر ہے اور کوئی

دلِ حزیں، ترا ان قاتلوں سے کیا رشتہ
مرے قتیل، ترا چارہ گر ہے اور کوئی

مجھے نکال، نمائش گہ رفاقت سے
یہ میرے لوگ نہیں میرا گھر ہے اور کوئی

فریبِ منزلِ آشفتگی کا خوف نہیں
ہم ایسے آبلہ پاؤں کو ڈر ہے اور کوئی

یہ اس کی بولتی آنکھوں کی گفتگو سے کھلا
ہم اعتبار سہی، معتبر ہے اور کوئی

پاتال

میں وسعتِ آفاق کا شاعر تھا مگر تم
نفرت کے سلگتے ہوئے پاتال میں لا کر
اب مجھ سے مرا نام ونسب پوچھ رہے ہو

O..........O

تم طعنہ بہ لب اس لئے ٹھہرے کہ مرا دل
آلودۂ تکمیل ہوس کیوں نہیں نکلا؟......
اس دھوپ میں جلنے کا صلہ کیوں نہیں مانگا
میں بندۂ تحریک نفس کیوں نہیں نکلا؟

اب پوچھ رہے ہو کہ مرے کون تھے اجداد؟
کس شہر کی مٹی سے اٹھی ہے مری بنیاد؟......
خود کر کے حقارت سے مجھے مائل فریاد......
اب وحشتِ گریہ کا سبب پوچھ رہے ہو؟
اے سنگ بکف، زہر بہ لب گھر کے مکینو!
اس خاک سے نسبت ہے مجھے تم سے زیادہ
اس ماں سے محبت ہے مجھے تم سے زیادہ!

O..........O

اب اور کوئی طعنہ و دشنام نکالو
یا بابِ حقارت سے مرا نام نکالو!

O

ہماری بستیوں میں آ چھپے ہیں ناگ بابا جی
اب ان کے زہر کا تریاق ہے بس آگ بابا جی

سراسیمہ ہے خلقت حفظ جان و مال کی خاطر
کہاں کی بین بابا جی، کہاں کا راگ بابا جی

اسی منظر میں تا حد نظر تھے پھول سرسوں کے
جہاں پھیلی ہوئی ہے نفرتوں کی آگ بابا جی

جھلس کر رہ گئے گندم کے دانے اتنا مینہ برسا
نہیں باقی بچا لقمہ برابر ساگ بابا جی

تعلق میں توازن کس طرح پیدا کیا جائے
ہم اہل درد سادہ دل، زمانہ گھاگ بابا جی

بہت اپنے لہو سے اس چمن کی آبیاری کی
اگر کلیاں نہیں کھلتیں، ہمارے بھاگ بابا جی

طلوع

اسی کوفے کی مٹی سے
ابھی وہ دل شکستہ، جاں تپیدہ، چاند سی لڑکی
طلوع ہوگی
جو گہری چادر ظلمات چہروں سے ہٹائے گی
بہت بکھرے ہوئے ٹوٹے ہوئے سنسار کی ڈھارس بندھائے گی
شکستہ پا امیدوں کو سہارا دے کے
ملبے سے اٹھائے گی
وہ لڑکی جلد آئے گی

ابھی آئے گی آنچل میں لئے ذرات تاروں کے
معطّر، تازہ تر کچھ پھول آئندہ بہاروں کے
وہ اپنی مٹھیاں بھر بھر کے ان راہوں پہ وارے گی
جہاں آنکھیں گنوا کر سو رہے ہیں جاگنے والے
کسی دہلیز پر آواز کا سورج اتارے گی
کوئی ٹوٹا ہوا زینہ ستاروں سے سنوارے گی
یہ سب تاریکیاں دامن میں بھر کے
کئی چہروں کے آئینے نکھارے گی
پھر اپنی عمر اس کُوفے کے اک تاریک زنداں میں گزارے گی
اگر خوش قسمتی سے بچ گئی تاریک زنداں سے
تو بہرے تیر اندازوں کے نرغے میں
سسکتی آخری سانسیں بڑی تکلیف سے لے گی
کہ ہم سچ بولنے والوں کو زندہ رکھ نہیں سکتے
وہ مقتل سے سلامت عین ممکن ہے نکل آئے
مگر بچ کر کہاں جائے گی آخر؟
سگانِ راہ استقبال کو تیار بیٹھے ہیں!

اے میرے قارئین

ہر اچھی بات سوچی جا چکی ہے
ہر اچھا شعر لکھا جا چکا ہے
برسنا تھا جنہیں، برسے وہ بادل
پگھلنا تھا جنہیں پگھلیں وہ شمعیں
سلگنا تھا جنہیں سلگیں وہ آنکھیں
تو پھر اے قارئین حرف و معنی!
تمہیں ہم کیا نیا قصہ سنائیں؟

O

جو باتیں آج کل ہم لکھ رہے ہیں
انہیں لکھنے کے موسم جا چکے ہیں

جنہیں ہم لکھ رہے ہیں بھونڈے پن سے
وہ اس سے پہلے لکھے جا چکے ہیں
کتابیں خوبصورت چھپ رہی ہیں
مگر اب قارئین اکتا چکے ہیں
جہاں تھی راگ درباری کی محفل
وہاں اب پاپ سنگر آ چکے ہیں
مگر مہدی حسن، مہدی حسن ہے
کہ تاثیرِ سخن ہی اصل فن ہے
یہی ایثار، تفسیرِ سخن ہے
کہ کاغذ پر لہو ٹپکا رہے ہیں
سو اب تک دادِ فن ہم پا رہے ہیں

اعتراف

عزیزانِ گرامی قدر!
اکثر واقعاتِ کربلا سن کر
ہمارا دل پگھلتا ہے
ہمارا بس نہیں چلتا کہ ماہ و سال کا پہیہ
گھما کر تیز تر، معکوس، جا پہنچیں
کنارِ آبِ جوئے نینوا، خنجر بکف، تنہا
صفِ اعداء کے آگے جا کے للکاریں کہ آؤ ظالمو دیکھو
حسینؑ ابنِ علیؑ تنہا نہیں
اس معرکے میں ہم بھی مثلِ خاکِ پائے سید ابرار شامل ہیں

ہمیں بھی افتخارِ خدمتِ شبیرؓ حاصل ہے
ہمیں بے وقعت و بے نام مت جانو
ہمارا جذبہء ایمان کامل ہے
یقیناً یہ صدائے حق
امیرِ لشکرِ باطل کو نامرغوب تر ہوتی
سو انجامِ تن خستہ‘ عزیزانِ گرامی قدر ظاہر ہے!
اسی انجام کے ڈر سے
عزیزانِ گرامی قدر!
چودہ سو برس سے ہم
ردائے خامشی اوڑھے
لبوں پہ قفل ہائے مصلحت ڈالے
ہر عہدِ ناروا کے جبر و استبداد کے آگے
نگوں سر ہیں
اگر لب کھولتے بھی ہیں
اگر کچھ بولتے بھی ہیں
تو رنگِ سرخیٔ رخسارِ جاناں کے حوالے سے
وصالِ یار‘ جشنِ موسمِ گل‘ مدحتِ شاہاں
یہی بس اپنے موضوعاتِ فکر و فن کے دھارے ہیں
جہاں دن ہو نکلتے ہیں اور راتیں آ دھرتی ہیں

وہیں خیمے ہمارے ہیں
ہم اہلِ بیتؓ کی تقلید میں ہر ظلم کے آگے
مثالِ کوہ‘ ڈٹ جانے کی خواہش دل میں رکھتے ہیں
مگر اپنی بیاضیں حاکمِ اعلیٰ کی اس محفل میں رکھتے ہیں
جہاں ہم ایسے کچھ راگی
سخن کی انجمن میں راگنے والے
شکستہ جان و تن پر جبر کر کے جاگنے والے
لفافوں کے تعاقب میں‘ مسلسل بھاگنے والے
سخن پیشہ‘ اپاہج‘ طالبانِ داد و زر‘ الفاظ کے تاجر
غبارِ سال و مہ میں اپنا بستہ چھوڑ آئے ہیں
جدھر کا قصد آغازِ سفر کی شرط ٹھہرا تھا
اسی منزل اسی بستی کا رستہ چھوڑ آئے ہیں
سو انجامِ تن خستہ‘ عزیزانِ گرامی قدر ظاہر ہے!

☆

O

معاملات عجب ہیں معاملہ کیا ہے
غزل تو خیر غزل ہے غزل نما کیا ہے

یہ کیا ہجوم ہے آشفتگی کے کوچے میں
بنامِ فن یہ تماشہ مرے خدا کیا ہے

یہ گل فروش کا مرقد ہے اور اس پہ کہیں
کوئی گلاب نہیں ہے یہ ماجرا کیا ہے

کوئی چراغ بکف اور کوئی ستارہ بکف
کسی کو علم نہیں سازشِ ہوا کیا ہے

سبھی کی اپنی گرامر ہے طوطی خانے میں
میں کس زباں میں کہوں میرا مسئلہ کیا ہے

تیرے عدو کو ضرورت ہے اب سہارے کی
گلے لگا لے اسے بڑھ کے، دیکھتا کیا ہے

O

(نذرِ وطن)

ترے وجود سے پہلے دھواں تھا خواب مثال
یہ میں کہ خواب تھا اور بیکراں تھا خواب مثال

مرے گواہ در و بام تھے شبِ مہتاب
مرا عدالتِ دل میں بیاں تھا خواب مثال

مرے یہ پھول مری نیند میں مہکتے تھے
یہ میرا باغ مرا آشیاں تھا خواب مثال

کبھی یہاں مری پرواز تھی درونِ قفس
مری یہ چھت یہ مرا آسماں تھا خواب مثال

میں سر برہنہ کڑی دھوپ کا مسافر تھا
یہ نکہتوں کی فضا، یہ سماں تھا خواب مثال

میں بے دیار تھا سرما کی بارشوں کا ہدف
یہ تیری گود ترا سائباں تھا خواب مثال

تری نوائے صداقت نے مجھ کو حرف دیئے
میں تھا ضرور، مگر بے زباں تھا خواب مثال

آئینے کے روبرو

کیوں مذاق کرتے ہو
فن کے آستانے میں!
تم تو کھوٹا سکہ تھے
وقت کے خزانے میں
ہر یزید کو پوجا
تم نے ہر زمانے میں
اپنا نام لکھوا کر
شاعروں کے خانے میں
عمر کاٹ دی تم نے
شہرتیں کمانے میں
فن کی بات کرتے ہو
کیوں مذاق کرتے ہو

☆

تم نے ظلم کی ہر شب
سیج پر گزاری ہے
جھوٹ کے پلندوں میں
سچ کی ڈینگ ماری ہے
ہر چمکتے سورج کی
آرتی اتاری ہے

☆

ہجو شب نہیں لکھتے
وقت ٹالنے والے
مصلحت کے سانچے میں
خود کو ڈھالنے والے
دیکھ کر ہوا کا رخ
رہ نکالنے والے
شاعری کے پردے میں
پیٹ پالنے والے
تم بھی ان میں شامل ہو!

☆

مدحتیں رقم کر کے
مختلف خداؤں کی
چاند کھینچ لاتے ہو
جیب سے خلاؤں کی
تم چراغ اور تم سے
دوستی ہواؤں کی!

☆

تہمت سخن پھر بھی
یار، خود پہ دھرتے ہو
بات بات پر یونہی
سرد آہ بھرتے ہو
ایسی کیا مصیبت ہے
کیوں یہ روپ بھرتے ہو
شعروفن کے پردے میں
کیوں مذاق کرتے ہو

☆

تم زمین کے باسی
آسماں کے طالب ہو
مندوں کے سائے میں
حفظ جاں کے طالب ہو
ہر چمکتے خنجر سے
تم اماں کے طالب ہو

☆

صاف کیوں نہیں کہتے
نام چاہئے تم کو
صبح کے لبادے میں
شام چاہئے تم کو
عشق ہو کہ مزدوری
دام چاہئے تم کو

☆

سلام

سلام ان پہ جو تابِ سخن نہیں رکھتے
کوئی ہجوم کوئی انجمن نہیں رکھتے

☆

سلگتے رہتے ہیں مانندِ چوبِ خشک سدا
وہ تن کہ جن پہ ہے خاکِ الم کی زرد قبا
وہ دل کہ جن کے مقدر میں ہے عذابِ وفا
وہ لب کہ جن کا نصیبہ ہے التماسِ دعا

☆

انہی لبوں کو سلامِ خلوصِ جاں پہنچے
انہی دلوں کو سلامِ سخنوراں پہنچے

☆

وہ آرزو جسے پیرایۂ ہنر نہ ملا
وہ زخم جن کی جراحت کو چارہ گر نہ ملا
وہ داغ جن کو کوئی صاحبِ نظر نہ ملا
وہ کربِ جاں کہ جسے حرفِ معتبر نہ ملا

☆

سلام ان پہ جو زندہ ہیں رنج سہتے ہیں
مگر نہ گریہ کناں ہیں نہ شعر کہتے ہیں!

O

O

یہ جو اب وحشتیں ہیں بھائی صاحب
مرض کی شدتیں ہیں بھائی صاحب

ستارے ٹوٹتے کیوں جا رہے ہیں؟
یہ کیسی ساعتیں ہیں بھائی صاحب

غزل کہتے مسلسل جاگتے ہیں
عجب بد عادتیں ہیں بھائی صاحب

یہ بے ترتیب کاغذ چھیڑیئے مت
انہیں میں نعمتیں ہیں بھائی صاحب

بہت خوش ہیں جدا ہو کر وہ ہم سے
ہمیں بھی راحتیں ہیں بھائی صاحب

کسی الجھن میں پڑنا چاہتے ہیں
ہمیں کچھ فرصتیں ہیں بھائی صاحب

شکستہ ہو رہے ہیں ان دنوں ہم
بہت سی حاجتیں ہیں بھائی صاحب

کوئی اک آدھ قضیہ ہو تو روئیں
ہزاروں کلفتیں ہیں بھائی صاحب

یہ افسانے سنے گا کون ہم سے
کسے اب فرصتیں ہیں بھائی صاحب

یہ کیسی دوریاں ہیں قبلہ گاہی
یہ کیسی قربتیں ہیں بھائی صاحب

ہدائت

مہذب گھر کے کتے
قیمتی گدّوں پہ سوتے ہیں
انہیں خوراک میں بادام پستے گوشت کے قتلے
ملائی دودھ کے ڈبے اور ایسی ان گنت چیزیں
فراوانی سے ملتی ہیں
انہیں سیریں کرانے کے لئے ان کے ٹرینز کو

ہدائت ہے
کہ جب ان قیمتی کتوں کو ٹہلانے وہ لے جائیں
تو ان رستوں سے مت گذریں
جہاں آوارہ بھوکے اور بدتہذیب کتے دندناتے ہیں!

O

O

کہاں جائیں کہ بزم آرائیاں سب ایک جیسی ہیں
ہماری شہرتیں رسوائیاں سب ایک جیسی ہیں

ہمارے شہر کی گلیوں میں بہتے ہیں کئی دریا
سبھی گہرے ہیں اور گہرائیاں سب ایک جیسی ہیں

فقط ناموں کی تبدیلی سے کب فطرت بدلتی ہے
رقیبوں کی کرم فرمائیاں سب ایک جیسی ہیں

کسی نے تبصرہ جھوٹے گواہوں پر کیا ہے یوں
کہ سب سچے ہیں اور سچائیاں سب ایک جیسی ہیں

جہالت دیکھ کر شرما رہی ہے ان کی دانش کو
کہ جن کی منطقیں دانائیاں سب ایک جیسی ہیں

ہم اپنے ساتھ لمحہ بھر کہیں رہتے نہیں ساجدؔ
ہماری محفلیں تنہائیاں سب ایک جیسی ہیں

O

وہی دشت ہے، وہی خار و خس، یہ بہار کیسی بہار ہے
کسی شاخسارِ امید پر کوئی پھول تک تو کھلا نہیں

پس کارواں، سرِ رہ گذر، میں شکستہ پا ہوں تو اس لئے
کہ قدم تو سب سے ملا لئے پہ یہ دل کسی سے ملا نہیں

دل سوختہ کو نہیں ملا وہ فروغ عمر کے باب میں
یہ چراغ اتنا جلا نہیں، یہ گلاب اتنا کھلا نہیں

مری واپسی کی سند نہیں مگر اک ذرا سی امید ہے
وہ رفیقِ راہِ سفر بنے تو سفر یہ اتنا کڑا نہیں

مرے اعتبار، بنام فن اسے کیوں غزل میں عیاں کیا
جو یہ پاس خاطرِ عشق تھا وہ بھر بھی تو نے رکھا نہیں

پُل

یہ پل میرے دنیا میں آنے سے پہلے
انہی ریل کی پٹڑیوں پر کھڑا تھا
ہزاروں دھواں چھوڑتے شنٹ کرتے ہوئے انجنوں کی تپش سہہ چکا تھا
ہزاروں ٹرینوں کے چلتے ہوئے تیز مدھم رگڑ دار پہیوں سے احوال دل کہہ چکا تھا
ابھی تک انہی ریل کی پٹڑیوں پر کھڑا ہے

☆

130

کئی بار میں سیڑھیاں چڑھ اتر کے
اسی پل کے سر سے گزر کر
کبھی اپنے مکتب، کبھی گھر گیا ہوں
مرے بچپنے میں یہ پل ایک بستی کے مانند تھا
یہاں دور تک سرہی سر تھے بہر سو
ستونوں سے لگ کر خدا نام پر ریزگاری کے طالب بھکاری
تعفن زدہ چیتھڑوں میں لپیٹے ہوئے اپنی لاشیں
ابھی تک انہیں کونوں کھدروں میں نوحہ کناں ہیں
جہاں میرے بچپن میں کاسہ بکف تھے
وہ کاسے کہ جن میں
وہ چاء پیتے تھے، بھیک لیتے تھے اور تیز بارش میں سر ڈھانپتے تھے
یہ پل مجھ کو بچپن میں لگتا تھا اونچا
زمیں سے فلک تک معلق سا رستہ
مجھے خوف آتا تھا چلتے ہوئے ہر قدم پر
کہیں پیش منظر سے میں ہٹ نہ جاؤں
پھسل کر کسی ریل گاڑی کے پہیوں تلے کٹ نہ جاؤں
مگر اب کے اس پل پر چڑھ کے
میں کیا دیکھتا ہوں
کہ چاہوں تو ہاتھوں کو نیچے بڑھا کر زمیں کی سم آلود مٹی اٹھا لوں

131

چمکتی ہوئی پٹڑیوں پر لکیریں بنا لوں
میں حیرت زدہ سوچتا ہوں کہ یہ کیا ہوا ہے
مرا قد بڑھا ہے کہ پل جھک چکا ہے؟

O

سال کے اختتام پر

یہ سال بھی آخر بیت گیا
کچھ ٹیسیں یادیں خواب لئے
کچھ کلیاں، چند گلاب لئے
کچھ انکھڑیاں پر آب لئے

☆

کچھ جلتے دن، کالی راتیں
کچھ سچے دکھ جھوٹی باتیں
کچھ تپتی رُتیں کچھ برساتیں

☆

کسی یارِ عزیز کا دکھ پیارا
کسی چھت پہ امیدوں کا تارا
کوئی تنہا شاعر دکھیارا
جس پہ ہنستا تھا جگ سارا

☆

اس شاعر نے جو حرف لکھے
اس میں تری یاد کے سائے تھے
وہ لوگ بھی آخر لوٹ گئے
جو صدیوں پار سے آئے تھے

☆

ان ہنستے بستے لوگوں نے
مرے سارے دکھ اپنائے تھے
پھر میں نے یاد کی مٹی میں
زخمی لمحے دفائے تھے

☆

یہ سال بھی آخر بیت گیا

☆

O

تمغۂ تہمتِ دگر، دل پہ سجا کے آ گئے
پھر ترے شہر میں گئے، نام کما کے آ گئے

دل کا چراغ لے کے ہم، گھر سے چلے تھے شام کو
صبح سے پہلے راہ میں، شہر ہوا کے آ گئے

بھیڑ میں بھی الگ رکھی اپنی متاعِ خال و خد
یہ تو نہیں ہوا کہ ہم چہرہ گنوا کے آ گئے

تھا ابھی رہ میں قافلہ اور ترے شکستہ پا
آخری سنگ میل کو ہاتھ لگا کے آ گئے

تیرا سلوک دیکھ کر دل تو بہت دُکھا مگر
لب پہ مگر تمام تر حرف دعا کے آ گئے

میرا مکالمہ تو صرف اہلِ دل و نظر سے تھا
کیسے مرے حروف میں رنگ فضا کے آ گئے